



15.5.89

537  
52777 ✓  
119

1801

Mohd. Yousuf  
Bindery M. A. Library  
A. M. U., Aligarh.  
Dated.....



Beegum Ma

۸۹۱۵۰  
۱۱/۱۱/۲۰۰۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

۱۵۲

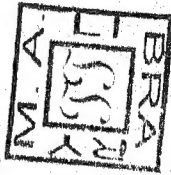
۹۴۸۳۹



۱۰۳  
۲۱۹

CHL  
CHECKED-2002

۱۵/۱۱/۲۰۰۹



نواب نصیر الدین احمد کی تہیاں مٹیں ہوئیں خاک ہو چکیں۔ مگر ابھی ان کی آنکھیں  
دیکھنے والے لوگ ہزار پانسو نہیں تو دو چار زندہ ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ مرنے والا نصیر  
کس آن کا آدمی اور کس شان کا مسلمان تھا۔ دولت تھی۔ ثروت تھی۔ حکومت تھی۔  
امارت تھی۔ مگر نخوت یا غور کبھی پاس آکر نہ پہنچا۔ باسٹھ سال سے اوپر عمر بانی۔ پونڈوں  
کا رئیس۔ مزاج کا غنی۔ دل کا شیر۔ روپے کے ڈھیر تھے۔ دولت کی افراط تھی۔ جوہلی  
مکان۔ جائداد۔ املاک۔ اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ مگر جس سے ملا جھک کر اور جس سے  
بولا ہنس کر۔ دونوں وقت لنگر عام تھا۔ جس میں مرتے دم تک فرق نہ آیا۔ غریب  
غریب اپنا بچہ۔ فقیر ایک نصیر کے دسترخوان سے سیکنڈوں ہند گان خدا  
پل رہے تھے۔ پھر یہ نہیں کہ کرم اور احسان۔ جس کو دیا اور جب دیا منت سے  
اور خوشامد سے۔ عجز کی یہ کیفیت کہ غریب پڑوسیوں کے گھر خود جاتا اور  
کھانا دیتا۔ خلق کا یہ حال کہ سائل کا سوال کبھی رد کیا نہ کرنے کا خیال آیا۔  
اس دولت پر اور اس ثروت پر گرمی کے تیسوں روزے دیں ہو یا پڑیں اور  
تندرست ہو یا بیمار ممکن نہیں کہ ناغہ ہوں۔ جاڑوں کی نماز فجر کر کر اتی سردی ہو  
یا چلنے کے دن ناممکن تھا کہ جماعت سے نہ پڑھے۔ وہ مرد کا مگر نصیری مسجد  
اور احمدی امام باڑہ آج تک اس کے کام اور اس کا نام روشن کر رہے ہیں۔



آدمی کیا ایک دریا اور مسلمان کیا ایک چشمہ تھا۔ جس کا فیض صبح سے شام اور خاص سے عام تک جاری تھا۔ یتیم اس کے در سے رانڈیں اس کے گھر سے۔ پانچ اس کی دولت سے، مسکین اس کی ثروت سے زندہ تھے۔ اور خوش تھے۔ یہ تھی وجہ یہ تھا سبب اور یہ تھا باعث کہ اس کے جنازے پر بڑھوں نے پچھاڑیں کھائیں۔ جوانوں نے سر بھڑکے اور بچوں نے داویلا مچائی۔ اب یہ اتفاق سے تعبیر کرو یا تقدیر سے کہ شہر بھر کے علاج اور دنیا بھر کے جتن کڑا لے۔ مگر بچہ نہ ہوا۔ اور بیوی بد نصیب اسی بچہ میں گھل گھل کر تمام ہوئی۔ یہ خیال کہ نصیب کی عمر اب نکاح کی یہ تھی درست نہیں۔ مرد ساٹھا اور پانچھا۔ عورت بیسی اور کھسی۔ روپیہ تھا۔ اطمینان تھا۔ سبے نکری تھی۔ خوشحالی تھی۔ پھر کیا وجہ تھی کہ غریب بقیہ عمر ٹھروں ٹوں بسر کرتا۔ ہاں جس بات پر اعتراض ہو سکتا ہے وہ پوشیدہ نہیں۔ راز نہیں۔ بات کھلی اور محالہ صاف اور حق یہ ہے کہ بنائے فساد جس نے برباد کیا یہ ہی ہے۔ نکاح کرتا۔ شوق سے کرتا ایک نہیں دو کرتا۔ چالیس کیا ساٹھ برس کی عمر میں کرتا۔ مگر بات سمجھ کر اور موقع دیکھ کر بیٹیوں کی کمی نہ تھی۔ کوارسی سے کوارسی اور بہتر سے بہتر لوگ بیٹی دیتے اور چوم چاٹ کر دیتے۔ کوارسی نہ ہوتی رانڈہ ہوتی۔ امیر نہ ہوتی۔ فقیر ہوتی۔ مگر ہڈی کی اچھی اور خون کی سچی۔ گھر کی مغلانی اور مغلانی بھی وہ جس کی ماکہڑے سینے سینے اور نانی پانی ڈھونڈتے ڈھونڈتے مری۔ شکل کی کیسی ہی اعلیٰ اور صورت کی کتنی ہی افضل کیوں نہ ہو۔ مگر حیثیت بھی ایک چیز ہے۔ نواب کی غلطی جو مغلانی سے نکاح کی صورت میں ظاہر ہوئی اتنی سنگین نہ ہو کہ اس پر الزام آ سکے۔ مگر یہ خیال بھی کچھ نہ کچھ وقعت رکھتا ہی ہے کہ اصل سے خطا نہیں کم اصل سے دفا نہیں۔ لاکھ راجا کے گھر آئی اور رانی کہلائی۔ لیکن ہم تو یہ ہی سمجھیں گے اور

سمجھتے ہیں کہ اگر نصیب اختیار کرنا تو بساندی بوٹی کا گندہ شور بہ نہ ہوتا۔  
اولاد کا رنج فقط بیگم صاحب کی تقدیر میں تھا اس کے بعد تو مغلانی کی  
گود میں پہلے ہی سال چمکتا ہوا لال تھا۔ افسوس یہ ہے کہ نصیب کو بہار دیکھتی نصیب  
نہ ہوئی۔ ضمیر چار ہی سال کا تھا کہ وہ رخصت ہوئے اور اس تمام اثاثہ کی مالک  
بی مغلانی ہوئیں۔

## دوسرا باب

کہاں پندرہ بیس روپے ماہوار کی مغلانی اور کچا چار پانچ لاکھ روپے کا تحفہ  
بلا شرکت غیرے اس کیلی کی ملکیت یا قبضہ میں تھا۔ سیرکی ہنڈیا میں سوا سیر ٹرا۔  
وہ بڑھ کر بولتی اور چڑھ چڑھ کر کہتی کہ سُننے والے بھی دنگ رہ جاتے مغلانی  
سے گھر والی ہوئی۔ گھر والی سے راج دلائی۔ جو کچھ کرتی ٹھیک اور جو کچھ نہ کرتی ٹھوڑا۔  
اس پر ہونی اولاد اور اولاد بھی بھاری پتھر نہیں چکدار ہیرا۔ سُنائی جو چاہتی اور کہتی  
جو جی میں آتا۔ مفلسی بُری بلا ہے اور غرض اس سے بدتر۔ محتاج عزیز اور غریب  
رشتے دار سُننے جو کہتی۔ اور اٹھاتے جو ڈالتی۔ دولت سب سے بڑی عیب پوش ہے  
اچھی اچھی سیدانیاں اور بڑی بڑی مغل زادیاں اس کے اشارے پر آنکھیں بچھاتی۔  
خدا کی شان تھی الف کے نام بے نہ آئے۔ مگر جلسہ میں سستا آگے۔ اور کلب میں  
سب سے پہلے صدمت تو اچھی تھی ہی اب لباس بھی کسی سے کم کیا بہتر ہی تھا۔ دھیم  
بچ گئی۔ سایہ بھی اور بوٹا بھی۔ کالر بھی اور سوٹ بھی۔ وہی وہ تھی۔ مگر وہ جو بچپن  
کے سُنے سُنائے دو چار کلے اور انٹی سیدی ایکسا آدھ آیت یا دغنی اس کا بھی کبھی  
نہ کبھی اثر ہو ہی جاتا تھا۔ روزانہ تو نہیں اور پنجگانہ بھی نہیں۔ مگر ہاں آٹھویں سوین  
ایکسا آدھ سجدہ بھی کر لیتی اور درود بھی پڑھ لیتی۔

ضہیر پلا اس ماسے دودھ سے جو کام سے سبزا اور نام کی عاشق زار اور بہان  
ایا دل کی گود میں جو درے پر نہیں اور نماز پر کھلکھلا میں۔ انجام ظاہر تھا۔ بڑا ہوا تو  
کہنے کو مسلمان ورنہ پورا کرستان۔ روزے کا نہ نماز کا نہ ذکر کا نہ نیاز کا۔ تعلیم کی کیفیت  
پہنچی کہ پانچ چار کتابوں کے بند پھر آگے نہ پڑھا۔ نہ نو کا حال یہ تھا کہ بغیر انگریزی اخبار  
لئے گھر سے باہر نکلتا قسم۔ امیر کا بیٹہ اللہ آمین کا بیٹہ۔ لاڈ پیار کا بیٹہ۔ کھانے پیتوں کا  
بیٹہ اس کے جہان ہونے میں کیا دیر تھی۔ چودہ برس کا لڑکا فیل کا فیل معلوم ہوتا  
تھا۔ مغلانی کو بیٹے کے بیاہ کا ارادہ یوں تو مدت سے تھا۔ مگر اب تو ایک ایک گھری  
ایک ایک سال تھی۔ دنیا بھر کی لڑکیاں چھان اوتھ بھر کے گھر کنگال ڈالے۔ مگر لڑکی سمجھ  
میں نہ آئی خدا خدا کر کے بی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ اور ایک جگہ بات ٹھہری۔ مغلانی  
روپے کی بھوک کی تھی تھی اور ٹھیک جانتی تھی اور درست کہ دولت اتنی کافی اور روپیہ  
اس قدر دافہ ہے کہ بھر بھر چھو دیاں اٹھاؤں اور روپے کی جگہ اشرفیاں لٹاؤں تو بھی  
نچھ کر میرے بیٹے کو اور دو تین پشتوں کو روپے کا توڑا نہ ہوگا۔ وہ صرف صورت کی  
جوا تھی اور حق یہ ہے کہ خود بھی چونکہ حسین تھی اور اتنی کہ اس بڑھاپے یا ادھیڑ  
پنے میں رائے ہو کر اور سہاگ کھو کر سو دو سو میں ایک تھی اس لئے اس کی تلاش  
غلط نہ تھی۔ لڑکی جو سمجھ میں آئی وہ مغلانی کی لڑکی تو نہ تھی۔ مگر پھر بھی اچھی بہت  
اچھی۔ سسرال آئی تو دبی دباؤ۔ مفلس غریب میاں کے رنگ اور ساس کے  
ڈھنگ دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں۔ مذہب تو اللہ کی عنایت سے گھر کیا محلہ بھر  
میں اللہ کا نام تھا۔ ہاں زمانہ کلب کی شرکت آندھی ہوا مینہ ناغہ نہ  
ہو سکتی تھی۔ مغلانی کا بہو کو اپنے رستہ پر لانا ضروری تھا۔ چنانچہ  
لئے آئی۔ کچی لکڑی کا سپدھا کرنا کونسی ٹیڑھی کھیر تھی۔ اشارے کی  
دیر تھی۔ بہو بھی اسی ڈگر پر پڑی۔ میاں کے دھڑے وہ کچھ کہ بغیر چھری

کانٹے کے کھانے کو ہاتھ لگانا گناہ، ساس کے شیوے پہ کچھ کہ ہندوستانی جوتی پہننے حرام۔ بہو بیچا رہی نے آخر کیا قصور کیا تھا۔ تھوڑے ہی روز میں ساس کم تھی اور بہو زیادہ۔ ہاں ایک بات تھی جو ساس کو ذرا کم مگر شوہر کو کچھ زیادہ بہتہ ناگوار گزری اور وہ پانچوں وقت کی نماز تھی۔ بن باپ کی بچی اور مفلس ماں کی بیٹی۔ خدا مفلسوں کو بہت یاد آتا ہے۔ کوار پتے کے جے جمائے خیال اور میٹھے بھجائے اثر جوانی میں اور تمول میں آسانی سے چھوٹنے والے نہ تھے۔ مزایہ ہوا کہ سر پر آیا رمضان۔ مغلانی یا ضہیر کو تو غرض ہی کیا تھی کہ بھوکے رہتے اور پیاسے مرنے ضہیر تو کھلے خزانے اور ہاتھ پکارے روزے داروں پر رات دن نہشتا۔ مگر مغلانی اتنا احسان اللہ پر ضرور کرتی کہ روزے کے بدلے دو آدمیوں کو کھانا مسجد میں بھیجتی اور یہ سمجھ کر کہ روزہ صرف مؤمنوں ہی کے لئے ہے یتیم خانہ میں بھی کچھ نہ کچھ بھیجتی رہتی۔ ایسے گھر میں اور اس قسم کے لوگوں میں رہ کر روزہ رکھنا آسان نہ تھا۔ دو تین روز تک تو دونوں ماں بیٹے خاموش رہے چوتھی سحری تھی کہ ضہیر نے ماں سے کہا۔ ”یہ سحری کا عذاب تو اچھا پیچھے لگا کہ نیند بھی حرام ہو گئی۔ اول تو یوں ہی بارہ بجے سوتا ہوں اُس پر غضب یہ ہے کہ جہاں ایک دفعہ آکھ کھل گئی تو پھر نیند نصیب نہیں۔ اگر ایسا ہی روزہ ضروری ہے تو آدمی اس طرح اٹھے کہ دوسرے کی نیند برباد نہ ہو۔ دو تین روز سے یہ ہی ہو رہا ہے۔ اچھا رمضان آیا کہ سوتے ہی کے لالے پڑ گئے۔“

مال۔ ”بیٹا اغریوں کے تو خدا اور رسول الگ ہی ہوتے ہیں صفت کی تکلیفیں ان کی تقدیر میں لکھی ہوئی ہیں وہ بھگتے ہیں۔ میں نے تو پر سوں بھی کہہ دیا تھا کہ روزے کے بدلے دو آدمیوں کو کھانا مسجد میں بھیج دیا کرو۔ مگر انہوں نے نہ سنا اب ان ہی سے پوچھو میاں شاکی۔ ساس ناخوش، روزے سے فائدہ

کیا اور حاصل کیا؟

ضمیمہ۔ موٹی سی بات ہے کہ اُس وقت مسلمانوں کی حالت ہی ایسی تھی کہ پیٹ کو ٹکڑا تھا نہ تن کو چٹھڑا، ایک رمضان پر ہی کیا منحصر تھا۔ یوں ہی بارہ مہینے کے فاسے تھے اس وقت کی ضرورتیں اور نفیس اس وقت کی حالتیں اور ہیں۔ مگر خدا بھلا کرے ان مفلس جاہلوں کا کہ اب تک وہی لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں۔ مال۔ تم اندر کی سہری میں جاسو وکل سے کچھ اور انتظام کروں گی۔

ضمیمہ دہن جس کا اصلی نام ساجدہ تھا اس لائق تو تھی ہی نہیں کہ میاں یاساس سے بحث کرتی۔ اول تو یہی، اب پر نئی دہن اور سونے پر سہاگہ افلاں دل ہی دل میں گڑی جا رہی تھی۔ یہ وقت تو کٹ گیا اور دن گذر کر رات بھی آئی۔ مگر اس نیک بخت نے پھر سحری کا نام نہ لیا۔ دھوئے کی آواز کان میں آئی اور چہروں کی طرح اٹھ پانی پی کلی کر پڑ رہی وہ بھی اگر آنکھ کھل گئی۔ نہیں تو اول ہی شام نیت کی اور لیٹ گئی۔ آدمیوں کی ماشا اللہ گھر میں گئی تھی۔ چار پانچ مائیں۔ پانچ چھ رشتہ دار۔ مغلانی، ضمیمہ، ساجدہ خاصہ چودہ پندرہ مسلمان ایک گھر میں تھے۔ مگر سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے اور ایک ہی خیال میں ڈوبے ہوئے۔ روپیہ کی نخوت دونوں مال بیوں پر کچھ اس قدر چھا گئی تھی کہ موت یا آخرت کا کبھی بھول کر بھی تو خیال نہ آتا تھا۔

دورے کیا ممکنے والے اور رمضان کیا رہنے والا تھا۔ آنکھ بند کر کے نکلے اور بات کرتے گذرے۔ عید پر آپہنچی۔ اب البتہ مغلانی کا گھر مسلمان کا گھر تھا۔ مکان میں سفیدی ہوئی۔ زیوریں ڈورے پڑے۔ رگڑیوں پر رنگ پھرا۔ کپڑا آیا۔ جوتیاں آئیں۔ غرض عید کی دھوم دھام میں مغلانی خاص اور عام سب پر سیت لے گئی۔ اس مسرت میں شریک نورسار گھر ہی تھا۔

مگر ساجدؑ کے چہرے سے جو حقیقی مسرت چمک رہی تھی۔ اس کا پتہ دوسری جگہ نہ تھا۔ اس کی خوشی کپڑے کی تھی نہ لٹے کی۔ گھنے کی تھی نہ پاتے کی۔ اس کی خوشی ادائیگی و فخر کا تخیل تھا جس کی برابری ان فانی اشیاء میں ایک بھی نہ کر سکتا تھا۔ اس کا صرف یہ اندیشہ تھا کہ خدا میرے روزے قبول کرے۔ اس کو روزہ بی مغلانی کی تمام جائز و حرام تھی۔ ہلال عید نے اپنا رخ دکھا کر رمضان المبارک کو دسار کیا۔ ساجدؑ کو شے پر تھی۔ چاند دیکھا اور دعا مانگی۔

”الہ العالمین مجھ گنہگار کنیز کے گناہ معاف کیجو۔ یہ مبارک مہینہ، برکت کے دن، رحمت کی راتیں ختم ہوئیں۔ مگر تیری نعمتیں موجود ہیں۔ اپنے فضل و کرم سے اپنے عطا و رحم سے میرے روزے قبول کر عذاب قبر سے محفوظ اور میرا سہاگ قائم رکھ۔“

دعا مانگ کر ساجدؑ نیچے آئی۔ دوپٹہ سنبھال کر اڑھٹھا اور ساس کو جھٹک کر سلام کیا۔ اس کا دل ایسی مسرت سے بھر پڑ تھا جس میں خوشی کا بحر بے پایاں لہریں لے رہا تھا۔ رات ختم ہوئی اور مؤذن نے روزِ عید کی آمد کا نذر پہنچایا۔ ساجدؑ نے وضو کیا نماز پڑھی۔ غمیر نے غسل کیا کپڑے بدلے۔ مغلانی نے کنگھی کی جوڑہ پہنا اور عید کے جلسے ہونے لگے۔ دن بھر وہ گہما گہمی اور چیل چیل رہی کہ کان پڑھی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ منوں مٹھائی الخارول ترکاریاں سیروں دودھ اور تولوں عطر صبح سے شام تک ہاتھوں سے اُٹھے۔ دن بھر ڈولوں اور گاڑیوں کا تاتا لگا رہا۔

روزِ عید میں کون سے لال لگے تھے کہ سال دو سال کا ہو جاتا۔ وہی بارہ گھنٹے کا دن اور بارہ گھنٹے کی رات۔ دن کے ختم ہوتے ہی مردانے میں ناچ اور گھر میں گانا بجانا شروع ہوا۔ باہر انعام و اکرام ملے اور اندر سیل۔ ادھی رات تک

جو ہر قیامت

یہ ہی دھوم دھام رہی۔ مخلدنی دن بھر کی ٹھکی ماری مسہری میں جا کر لیٹی۔ آنکھیں بند کیں اور سوسنے کی تیاری، ٹخنے پر ٹپ ٹپ آنسو گرنے شروع ہوئے۔ دیکھتی ہے تو رشتہ کی خالہ زاد بہن دبیمہ اللہ جو اوپر کا کام کرتی تھی۔ پاؤں دبا رہی ہے اور رو رہی ہے۔ پوچھا کیا ہے؟ نہ معلوم سکین کا نتیجہ تھا یا دل کی کیفیت۔ طبیعت اور زیادہ بگڑ گئی کوشش کی کہ چھپاؤں قصہ کیا کہ ضبط کروں۔ مگر ناکام رہی۔ اتنے عرصہ میں مخلدنی تین چار بار اصرار کر چکی تھی۔ جب اُچکار کر دریافت کیا تو کہنے لگی۔  
”کیا عرض کروں۔ آپ آرام فرمائیے۔“

مخلدنی۔ ”آخر کہہ تو سہی معاملہ کیا ہے؟“  
بسم اللہ۔ ”کچھ نہیں آپا یوں ہی خیال آگیا۔“  
مخلدنی۔ ”آخر وہ ایسا کیا خیال ہے؟“  
بسم اللہ۔ ”آپ آرام کیجئے اب نہ روؤں گی۔“  
مخلدنی۔ ”مگر بتانے میں کیا قباحت ہے کسی نے کچھ کہہ دیا۔“  
بسم اللہ۔ ”جی نہیں۔“

مخلدنی۔ ”تو پھر یہ اس وقت رونے کا کیا سبب؟“

بسم اللہ۔

مخلدنی۔ ”بتا میں پوچھ کر رہوں گی۔ بتا کیا ہوا؟“

بسم اللہ۔ ”میں دن بھر خدا کی قدرت دیکھتی اور اپنی حالت پر غور کرتی

رہی مجھ سے بڑھ کر کم بخت شاید دنیا میں کوئی بھی نہ ہوگا۔ سات بیٹے سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ مگر کوئی دن اور رات ایسی نہیں جاتی کہ جو بات آنکھوں کے سامنے ہے۔ جو کانٹا دل میں کھٹک رہا ہے اس کو فراموش کر سکوں۔ کھاتی ہوں۔ پیتی ہوں۔ منستی ہوں۔ بولتی ہوں۔ دنیا کے سب کام اور

زندگی کی ہر ضرورت پوری کر رہی ہوں۔ بھوک مجھے لگتی ہے۔ پیاس مجھے معلوم ہوتی ہے۔ نیند مجھے آتی ہے۔ جاڑوں میں گرم کپڑے گرمی میں ٹھنڈا پانی کو نسا کام ہے جو میں نے چھوڑ دیا۔ مگر دل کی وہ کلی جو آج ہی کے روز اسی وقت مرجھا گئی۔ اب نہیں کھل سکتی۔ وہ صورت جس کو موت نے مجھ سے چھین کر ہی گور سلما دیا۔ میری آنکھ سے جدا نہیں ہو سکتی میرا شوہر میرے سر کا دار و ستار میری زندگی کا سہارا زیادہ دن نہیں، چند گھنٹے بیمار رہ کر اسی عید کی آدھی رات کو میری زندگی برباد کر گیا۔

عید کا وہ دن جس خوشی سے بسر ہوا اب میسر آنے والا نہیں۔ اور رات کو جو ستم ٹوٹا۔ وہ دل سے جانے والا نہیں۔ شام کے وقت جب دل زیادہ تڑپا تو آپ سے تنخواہ مانگی۔ کہ میں بھی قبرستان جا کر اپنی عید منا لوں اور اس صورت کے بدلے اس خاک کے ڈھیر کو سلام عید کر لوں۔ آپ نے اس وقت کچھ نہ دیا۔ میں یوں ہی چلی گئی۔ رستے میں خیال آیا کہ مرنے والا دنیا بھر کے عیش کرا گیس اچھے سے اچھا پہنایا اور بہتر سے بہتر کھلایا آج تو اس کی قبر جس طرح بنے ہواؤں۔ برس کا برس دن دنیا عید کی خوشیاں منا رہی ہے۔ کانوں کی بالیاں اسی کا صدقہ اور اسی کا طفیل ہے۔ جب وہ نہیں تو یہ رہ کر کیا کریں گی۔ ان کو بیچ کچھ ریاں اور مٹھائی لیکر قبر پر پہنچائی۔ سینکڑوں مانی کے لال۔ بوڑھے بھی اور بچے بھی اور جوان شیر ہزاروں من مٹی کے بیچے دیے پڑے تھے۔ تھوڑی سی فقیریاں کچھ پانچ اور معصوم بچے کھیلنے پھرتے تھے ان کو کھلایا اپنے ہاتھ سے پانی لائی اور پلایا اور دعا کی۔ کہ اس کا ثواب اس مرنے والے کی رُوح کو پہنچے۔ ٹھٹھا ہو رہا تھا کہ ملاجی نے اذان دی۔ دل نہ مانتا تھا اس خیال سے کہ آپ ناخوش ہوں گی۔ چلی آئی مگر میرا دل وہیں پڑا ہوا ہے اور وہی رہ رہ کر یاد آ رہے ہیں۔



آپا گھٹنے نے ابھی بارہ بجائے ہیں۔ آدمی رات کا یہی وقت تھا جب مرنے والا میری آنکھوں کے سامنے دم توڑ رہا تھا اُس نے مجھ کو قریب بلا کر میرے سر پر ہاتھ رکھا۔ لٹکین دی اور خدا کے سپرد کیا۔ میں جانتی ہوں کہ وہ مرچکا اب رونا دھونا بیکار ہے۔ مگر دل کا علاج کیا کروں کہ یہ کم بخت اسکی صورت کو نہیں بھولتا۔ آپا آج ہی کے اُس کا انتقال ہوا تھا۔ اب وہ مجھے کبھی نظر نہ آئے گا۔ مگر آنکھوں کا کیا کروں کہ یہ کسی طرح سے نہیں تھمتیں۔“

اتنا کہہ کر بیسہ اللہ کی طبیعت بگڑ گئی اور وہ روتی ہوئی مکروہ سے باہر نکلی۔ ادھر مغلانی خاموش تھی اور گھٹنہ بتا رہا تھا کہ رفتارِ عمر کس طرح طے ہوئی۔ شمع کہہ رہی تھی کہ رات سحر ہونے والی ہے۔ سوچنے لگی کہ یہ بچا رسی بیسہ اللہ میرا ہاتھ نیکنے والی۔ اس طرح یاد شوہر میں تڑپے اور میں جو ہزاروں صرف کروں کبھی بھول کر اس کا دھیان نہ کروں جس کی بدولت بیٹی راج کر رہی ہوں۔ اس خیال کا آنا تھا کہ مرحوم کی تصدیق آنکھ کے سامنے پھر سی۔ اور موت کی خوفناک گھڑی سامنے آئی۔ سوچنے لگی کہ موت بہر حال آئی اور یہاں سے جانا مگر وہاں جا کر کیا کروں گی یہ تمام عیش آرام یہ سب جلوے جیسے زندگی تک کے ہیں یہاں کی تمام ضرورتیں خوب پوری ہوئیں نفیس سے نفیس کپڑے اعلیٰ سے اعلیٰ زیور قیمتی سے قیمتی بچھونا۔ افضل سے افضل کھانا۔ لیکن کوئی دن کیا کوئی گھڑی ایسی نہ گذری کہ وہاں کی ضرورتوں کا بھی خیال آتا اور سمجھتی کہ ایک روز اس زبردست بادشاہ کے حضور میں حاضر ہونا ہے۔ جس کی حکومت ابدی اور جس کا راج مستقل میری صاحبی عارضی میری خوشیاں فانی۔ اور میری امارت پانی کا بنیلہ دیر کی ریت اور دودھ کا جھاگ! ان ہی خیالات میں غرق اور تفکرات میں الجھی کچھ دیر پڑی رہی

چاہا بہت کہ نیند آئے۔ مگر نہ آئی۔ مجبوراً اٹھی اور سر ٹہلی اور ہر ٹہلی۔ بڑی دیر وہ کوہلا کر حکم دیا قصہ سننا و قصہ سنتی رہی۔ مگر نیند کسی عنوان آئی تھی اور نہ آئی دوسری دیر وہ سے کہا کتاب پڑھو۔

**کتاب خواں**۔ شروع سے کوئی کتاب پڑھوں۔

مغلانی۔ "نہیں یہ لو۔ یہاں سے پڑھو۔"

**کتاب خواں**۔ "جنت کی دھتیا اور مغرب کی رسیا کلب کے جلسہ

سے لڑتی تھی گرمی کا موسم تھا آفتاب غروب ہو چکا تھا اور ہوا کے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے فرحت بخش آرہے تھے۔ گاڑی ساتھ تھی۔ حکم دیا کہ گھر جاؤ۔ خود پیل چلنے لگی۔ وقت سہانا تھا۔ اور ہوا سرد و دُر لکھ لگی اور ایسی سرک پر جا پہنچی۔ جہاں پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ چاروں طرف بھٹکتی پھری مگر کہیں رستہ نہ ملا۔ یہاں تک کہ رات نے سیاہی کا برقع روئے زمین کو اڑا دیا اور جنگل میں سناٹا چھا گیا۔ ہر طرف نگاہ دوڑائی۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ مگر آدمی نہ آدم زاد۔ دل ہوا ہوا کیلچ دھکڑ دھکڑ کرنے لگا۔ ہوا کے فرائوں کے سوا اس اندھیرے گھپ میں اور کوئی آواز نہ تھی۔ چینی چیلانی دوڑی۔ لپکی۔ حیران پریشان ٹھہری بڑھی۔ مگر بے سود اور بیکار خوف کے مارے اور دشت کے سبب دم لکل رہا تھا اور رُوح فنا ہو رہی تھی، آسمان کے تارے بھی ٹھٹھے لگا کر روپوش ہوئے اور سیاہ گھٹانے ڈیرے ڈالے وقفہ اولوں

کی بوچھاڑ شروع ہوئی اور سفید چادر بیابان کے ہر چے میں کچھ گئی۔ بادل کڑک رہے تھے مگر بجلی مطلق نہ تھی۔ او لے پڑ رہے تھے۔ لیکن میٹہ بہت ہلکا تھا۔ بوندیاں تھیں مگر کم، جس کی پھلی عمر اس طرح بسر ہوئی کہ رنج خواب میں اور تکلیف بھول کر بھی پاس آکر نہ بھٹکی اس پر جو کچھ گذرتی وہ بیان سے باہر ہے۔ کشت تھی۔ خاموش تھی۔ سہمی ہوئی۔ ڈری ہوئی۔ لرز رہی تھی۔ تھرا رہی تھی۔ گھبرائی ہوئی۔

سٹ پٹائی ہوئی۔ کبھی ادھر سے ادھر بھاگتی اور کبھی ایک جگہ کھڑی ہو جاتی۔ مگر  
 لمینان کی کوئی صورت پناہ کی کوئی جگہ میسر آئی نہ نصیب ہوئی۔ گیدڑ چیتے۔  
 لنگور چٹائے۔ سانپوں کی پھنکار تھی۔ اولوں کی بھرماری تھی۔ چٹائیں تھیں۔ پہاڑ  
 تھے۔ راکھ کے ڈھیر تھے۔ خاک کے انبار تھے۔ اس جدت کی شدید اہم کو یقین ہو گیا  
 کہ دم نکلا اور جان چلی۔ یہ قیامت خیز سماں یہ مصیبت انگیز وقت خدا دشمن کو بھی  
 نہ دکھائے۔ ستائے کا میدان اور ہوا کا عالم تھا۔ رستہ بتانا تو درکنار کوئی  
 بات تک کرنے والا نہ تھا۔ کپڑے جوڑا، بدن شور بہ شور ایک درخت کے نیچے  
 بیٹھ کر رونے لگی۔ خدا خدا کر کے سامنے سے روشنی نمودار ہوئی اور ایسا معلوم ہوا  
 کہ منہ والا شور ہاتھ میں چراغ لئے رو برو کھڑا ہے۔ کپڑے سپید براق۔ لگی چھین مارنے  
 لگا ہوتا کیا تھا اور سنتا کون تھا بدن میں رعشہ ہاتھ پاؤں میں کپکپی، چاہتی تھی زمین  
 میں دھنس جاؤں درخت میں گھس جاؤں کہ مردے نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور کہا :-

رمضان کا مبارک مہینہ آئے اور نکل جائے فرشتے اور انسان  
 اس کے فراق پر آنسو گرائیں اور تجھ کو تیرے گھر والوں کو غیبت  
 تک نہ ہو۔ خدا کے نیک بندے اپنے محبوب کے حکم کی تعمیل میں  
 بیک کہیں اور توان پر خفا ہو۔ ایک نیک لڑکی ایک مسلمان  
 عورت تجھ جیسی ناہنجار اور جفا شعار کے قبضہ میں پھنس کر سحری و  
 افطار سے محروم ہو۔ مسلمان کا گھر اور سحری گناہ۔ مظلوم تیرے  
 ظلم سے اور محکوم تیرے حکم سے دو گھونٹ پانی کے پی کر روزہ  
 رکھے۔ تو ڈسٹ ڈسٹ کر کھائے اور تن تن کر پیے۔ اور روزہ دار  
 بارہ تیرہ گھنٹے کا پہاڑ سا دن گزار کر بھی پانی سے افطار کرے  
 افسوس تیری حالت پر اور شرم تیری صورت پر!!

بدبخت! وہ وقت زیادہ دور نہیں جو بتا دے گا کہ جس کو اپنا  
سمجھا وہ غیر تھا۔ اور جس کو غیر جانا وہ اپنا تھا۔

مغلانی شروع ہی کی سطر میں سُنتے پائی تھی کہ اس کی آنکھوں میں عمر گذشتہ  
اور حالت موجودہ کا تمام نقشہ پھر گیا اور ایسا معلوم ہوا کہ خود اسی کی تاریخ کوئی مختصر  
لکھ رہا ہے۔ جسے اللہ ہی کی مصیبت نے اس کی طبیعت خراب کر دی تھی۔ کتنا پیٹ  
بالکل ہی بے قابو کر دیا اور یہ حالت ہو گئی کہ گویا نصیب اس کی بر باد ہی کی داستان  
بیان کر رہا ہے۔ سُنتے ہی میری کی طرح تھر تھر کانپنے لگی۔ سب کو ہٹا دیا بہت  
دیر تک روتی رہی۔ اب نیند کہاں۔ کھڑی ہوئی اور صحن میں آئی تیرپو پھٹ رہی تھی۔  
اور یہ سماں بجائے خود اس قدر مؤثر تھا کہ ہر شے پر جو آنکھ کے سامنے تھی فنا کا جلوہ  
برس رہا تھا اور رخصت ہوتی ہوئی رات جو مریض کی طرح دم توڑ رہی تھی آئے  
والمے یہاں سے گلے بل بل کر بے ثباتی دنیا کے نعرے لگا رہی تھی۔ اس منظر نے  
یقین دلایا کہ موت سر پر آ پہنچی۔ ندامت کے آنسوؤں سے روتی ہوئی نماز کو کھڑی  
ہوئی۔

## تیسرا باب

بھلے گھوڑے کو ایک چابک، بھلے آدمی کو ایک بات! مغلانی اگر آدمی ہوتی  
اور آدمی بھی سمجھدار تو جسے اللہ کی داستان اور کتاب کا بیان دونوں عمارت  
زندگی کی ان بنیادوں کے واسطے جو کمزور ہو چکی تھیں ارٹاڑ کا کام دیتے اور  
ڈنگلاتا ہوا ایمان پہاڑ کی طرح مضبوط ہو جاتا۔ مرحاتی اور اس سبق کو نہ بھولتی۔  
کھوئی ہوئی دولت اور گئی ہوئی نعمت خدا نے گھر بیٹھے بھیجی۔ مگر طبیعت میں شرارت  
ہوتی اور اعلیت سے بے خبر نہ ہوتی تو یہ نوبت ہی کیوں آتی۔ دو چار دن تو شیخ  
بھی کھٹا کھٹ رہی اور نماز بھی جھپا جھپ۔ مگر ادھر تو لڑائی عقل اور گداز وقت

وہ ڈر رہا نہ خوف نماز تو خیر گنڈے دار ہوئی مگر شیخ کا جوش پندرہ دن بھی نہ رہا۔ اور آخر کار دونوں القط۔ وہی دنیا اور دنیا کے دھندے، وہی کلب اور کلب کے چندے۔ اس گود کی اور اس دودھ کی ایسی ماں کی اور ایسی عورت کی اولاد جیسی اٹھتی ظاہر ہے۔ ضعیف آغاز شباب ہی میں عذابِ ثواب کا قائل نہ تھا اور اتنا مسلمان تھا کہ بیوی کی سحری اپنی نیند پر قربان کر دی۔ پورا جوان ہوا تو عمر کے ساتھ ہی ساتھ لاندہی میں بھی ترقی کرنا گیا۔ غصہ اس پر اتنا ہے کہ پڑھا نہیں۔ لکھا نہیں مگر مشکل سے مشکل مسئلے اور پیچیدہ سے پیچیدہ مرحلے میں رائے دینے کو موجود اور صلاح دینے کو تیار۔ حدیث۔ قرآن۔ فقہ۔ منطق کوئی بحث ایسی نہ تھی جس میں وہ بند اور کوئی گفتگو ایسی نہ تھی جس میں وہ خاموش۔ مگر بڑی خرابی اگر یہ بڑی کہمیاں بیوی کے مزاج میں آسمان زمین کا فرق تھا۔ ساجدہ اول اول تو میاں اور ساس کے رنگ دیکھ کر اسی طرف ڈھل گئی تھی۔ بلکان سے بھی دو قدم آگے مگر میکے میں ایک روز غلط تھا وہاں جو مولوی صاحب کی تقریر سنیں تو لرز گئی اور عہد کر لیا کہ حیاں رہے یا جائے اور گھر بگڑے یا سنورے میں اس ترقی کی طرف قدم نہ اٹھاؤں گی۔ جو درحقیقت تنزل کا پوشیدہ ماز ہے۔ وعظ تو معمولی تھا مگر خاتمہ کے الفاظ جو ساجدہ کے دل میں گر گئے یہ تھے۔

”بیویوں! اگر وہ پہلی آواز جو فانی دنیا نے کان میں پہنچا کر ایک زبردست طاقت کا اعلان کیا یا دہو تو صداقت کے کانوں سے سنو اور انصاف کی نظر اس شجرِ حیات پر ڈالو۔“

اس درخت پر رنگ برنگ کے طائر اپنی اپنی بولیاں بول گئے اور ایسے ایسے نغمے گائے کہ اب تک ان کا رس کانوں میں موجود ہے۔ ان کا قیام ایک رات کا سیرا تھا۔ وہ اذانِ مغرب

کے ساتھ ان ڈالپوں پر چمکے اور نماز فجر سے قبل رخصت ہو گئے  
 اگر پانی کے وہ چند قطرے جو سب پہلے جسدِ خاکی پر پڑے اور جن کی تہ  
 میں غسلِ آخری نہاں تھا۔ فراموش نہ ہوئے ہوں تو شوق کے قدم بڑھاؤ  
 ایمان کی آنکھیں کھولو اور دیکھو اس چمنستانِ زندگی میں ایسے ایسے  
 گلہائے رنگیں کھلے ہیں۔ جن کی خوشبو نے ایک دنیا کو مہکا دیا۔  
 ان کا عرصہ حیات صرف ایک رات تھی۔ غروبِ آفتاب نے ان  
 کو زندہ کیا۔ اور صبا کی سرسراہٹ سے پہلے مرجھا گئے۔ اب وہ طائر  
 ہیں نہ پھول۔ مگر ان مسافروں کے نقش پا ابھی موجود ہیں۔ ان کے  
 کارنامے ماہِ کامل کی طرح روشن اور آبِ زلال کی طرح صاف  
 ہیں۔ آؤ باغیچے فانی کے ان سرسبز و شاداب پودوں پر نظر ڈالیں۔  
 جنہوں نے عورت کی ہستی میں ظہور کیا۔ آج بھی وہی چہرے ہیں۔  
 وہی صورتیں وہی کھڑے ہیں وہی موڑیں۔ مگر ان چہروں پر وہ  
 نورِ ان پھولوں میں وہ خوشبو، ان پودوں میں وہ طراوت نہیں  
 جو آج سے نصف صدی پیشتر تھی۔ ان قدموں پر قدم رکھو۔ پتہ  
 ڈھونڈو اور سراغ لگاؤ۔ کوشش اس جگہ پہنچا دے گی۔ جہاں  
 تلاش کی آنکھیں تماشے دیکھیں گی۔ جن کے ساتھ ہی شانِ اسلام  
 کا خاتمہ ہو جائے گا۔ وہ صورتیں دیکھو گے جن کی رگ رگ سے وہ  
 گھر دیکھو گے جن کے چپے چپے سے اسلام کی صدائیں بلند ہوں گی۔ مگر  
 دلی بھر کر دیکھنا، جی بھر کر ٹھہرنا اور پیٹ بھر کر دیکھ لینا آنکھیں ان  
 صورتوں کو جی ان باتوں کو۔ دل ان معاملات کو اور نگاہیں ان  
 نبیالات کو ترسیں گی اور ناکام۔ ٹھوٹیں گی، اور بے سود۔ یہ وہ

عورتیں ہیں جن کے سفید بال متانت کی کنگھی سے آراستہ اور  
جن کے خلوص بھرے دل صداقت کے پھولوں سے مزین  
ہیں ان کے سروں پر جالی کے ڈوپٹے احمد آبادی اور گجراتی  
بنیلوں سے مزین نہ ہوں۔ مگر ان کی موٹی چادریں لٹھے اور زین سکھ  
کی دھریں خوفِ خدا کے بیشش ہاتھوں اور گجروں سے ہبک  
رہی ہیں۔ یہاں مذہبِ زبان سے کہنے اور قلم سے لکھنے کو  
نہیں ہے، جھومر کی لڑیوں میں، مالا کے ڈوروں میں دھک رہا  
ہے، بھالوں میں، اور بالوں میں، چھٹیوں میں اور چالوں میں حیا  
ان کا زیور ہے، شرم ان کا لباس، ادب ان کا بھر ہے اور  
رحم ان کا شیبہ، دیکھو سامنے دیکھو اور اس خاتون پر نظر ڈالو  
یہ بال کامیابی حیات کا سہرا باندھ کر سفید ہوئے ہیں۔ یہ آنکھیں  
گھڑیوں خوفِ خدا سے روئی ہیں اور یہ پیشانی گھنٹوں سجدے  
میں رہی ہے یہ مفلس اور فقیر نہیں، وہ ہے جس کے ہاتھ سے  
ہزاروں لاکھوں روپیہ عمر بھرا اٹھا اور اب بھی ایک محقول خاتون  
اور پورے گھرانے پر حکومت کر رہی ہے۔ یہ نواسوں کی نانی  
اور پوتوں کی دادی ہی نہیں نوکروں کی آقا اور لونڈیوں کی  
مالک بھی ہے۔ اقبال کے سایہ میں جوانی بڑھاپے سے بدلی،  
اور آج خلق کی زنجیر اس پوسیدہ گھر اور تنگ مکان میں گھسیٹ  
کر لائی ہے۔ چھوٹے لڑکے کا بیاہ ہے اور مفلس بھانجی کو بلاوا  
دینے خود آئی ہے!! اس منہ سے باتیں نہیں پھول جھڑ رہے ہیں یہ  
پھول رہنے والے نہیں۔ اپنے دامن بھرو۔ زمانہ بہشت جلد چن اسلام کو

ان جوہروں سے محروم کرنے والا ہے۔ یہ واقعات فساد اور معاملات خیاب و خیال ہو جائیں گے۔ صداقت کی شہادت پیش نظر رکھ کر ایمان کی ترازو ہاتھ میں لے کر فیصلہ کرنا اور بتانا کہ کیا تمنا اور کیا ہو گیا۔ نو دیکھو!

اے ہے مریم! قربان کی تھی پیک۔ میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ایک کیا چار کرتوں کی بوجھ دیتی۔ اس مردار نے مجھ سے ذکر ہی نہیں کیا۔  
مریم۔ ”خالد اماں پیک کا کیا ہے۔ یہ تو میں نے ایک بات یوں ہی کہہ دی  
اللہ آپ کو شادی ریحانی نصیب کرے۔ میں تو بڑی خوشی سے چلتی۔ مگر ادھر  
تو بچوں کو دیکھ لیجئے اس کی آنکھیں دکھ رہی ہیں، اُس کے گانگن نکل رہی ہے  
ادھر ان کے اپنے کھانے پینے کا کچھ انتظام نہیں۔ خدا نے چاہا تو کسی چالے  
میں اگر شریک ہو جاؤں گی۔“

حالا۔ ”بٹی کیا بچوں کی سی باتیں کرتی ہے بچے اچھے نہیں ہیں تو وہ بھی  
تو اپنا ہی گھر ہے۔ کسی غیر کا نہیں۔ جو ضرورت ہو گی انتظام ہو جائے گا۔ میاں کی  
تم نے خوب کہی۔ بیٹیاں بیٹے جاتی ہیں تو کیا دامادوں کے کھانے کا الگ انتظام  
ہوتا ہے۔ کیا ہم اتنا بھی نہیں جانتے کہ گھر والی کے آنے سے مرد کو کسی تکلیف ہوتی ہے۔  
یہ بھی کہیں دنیا میں ہوا ہے کہ بیٹی کو تو بلا لیا اور داماد کو بھول گئے۔ پہلے کھانا ان کا  
پچھے تمہارا۔ جو ہنسی روٹی اللہ دے گا۔ پہلے ان کو پہنچ جائیگا۔ پھر تمہارے آگے  
رکھیں گے بلا اور حقیقت ان ہی کا ہے مگرے تم کو جا رہی ہوں ابھی تو زمانے اتنی  
ترقی نہیں کی کہ بیٹیوں سے واسطہ رکھیں اور دامادوں کے آرام سے غافل ہو جائیں۔“  
بٹی تمہارا چلنا ضروری ہے۔ اور تمہاری شرکت لازمی ہے۔ کیا  
میرے دل میں وہم نہ آئے گا کہ سگی ماں جانی جہاں آرا کی بچی شہر کے شہر میں موجود ہو اور



دوہا کے سر پر آنچل نہ ڈالے۔ میری آنکھیں تو آج تین دن سے جہاں آرا کو ڈھونڈ رہی ہیں۔ وہ زندہ ہوتی تو بھانجے کو دوہا دیکھ کر کتنی خوش ہوتی۔  
 ہر یکم۔ ”یہ تو آپ درست فرماتی ہیں۔ مگر میری حالت کو بھی تو دیکھئے پھر کہنا پاتا تو تقدیر کا ہے شکوہ نہیں۔ مگر کپڑے تو ڈھنگ کے ہوں۔ کچھ ایسی آکر پڑی ہے کہ ختم ہی نہیں ہوتی آپ بڑی ہیں مگر بھائی تو چھوٹا ہے اس وقت تو آپ محاف کیجئے پھر دیکھی جائے گی۔“

خالہ۔ ”لو کی تیری عقل کو کیا ہو گیا۔ امیر غریب ایک ہی تھان کے ٹکڑے ایک ہی قبیل کے چٹے بٹے ہیں۔ پتے کیسے ہی ہو جائیں۔ کوئی سبز ہے۔ کوئی زرد۔ مگر جڑ تو ایک ہی ہے۔ میں نے دھوپ میں بال سفید نہیں کئے۔ کپڑے اور گہنا لے آئی ہوں۔ تم منہ ہاتھ دھوؤ۔ کنگھی چوٹی کرو۔ بچوں کو نہلا دو۔ ان کے کپڑے بھی موجود ہیں۔ گاڑی تیار رکھ دی ہے۔ مرہم جلدی کر۔“

ہر یکم۔ ”کیا عرض کروں اس وقت تو جانے ہی دیجئے میں انشا اللہ دو چار روز میں حاضر ہوں گی۔“

خالہ۔ ”واہ یہ بھی کوئی بات ہے۔ تم کو دہم نہیں آتا کہ بھائی کے سر پر آنچل نہ ڈالو۔“

ہر یکم۔ ”پھر آپ فرمائیں گی کہ ان لڑکیوں کے داغ بگڑ گئے ہیں۔ کیا آنچل ڈالنا نہایت ضروری چیز ہے۔ میں تو اس کو ایک فضول رسم سمجھتی ہوں آپ اس پر اس قدر زور کیوں دیتی ہیں؟“

خالہ۔ ”میں نے تو یہ بھی نہیں کہا۔ کہ ان لڑکیوں کے داغ بگڑ گئے ہیں۔ یہ کہتی ہوں کہ جہت نے ان کی آنکھوں میں کچھ ایسی چکا چوند پیدا کر دی ہے کہ اپنے اصلی عیروں کو فراموش کر رہی ہیں۔ تم اس آنچل ہی کو لے لو۔ فضول کہہ رہی ہو۔“

مگر اس میں ایجاد کرنے والوں نے کچھ نہ کچھ ضرور رکھا ہے۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ آنجل اتنی ضروری چیز ہے کہ بغیر تمہارے آنجل کے نکاح ہی نہیں ہو سکتا یا تمہاری شرکت آنجل میں نہایت ضروری ہو۔ ہاں میں اس کی خوبیوں کی قائل ہوں اور یہ تمہاری غلطی ہے کہ تم اپنی قدامت کی قدر نہیں کرتے کیا تم کو اس سے انکار ہے کہ بیٹی پر ایادھن ہے اور وہ شوہر کی ملکیت ہے شادی کے بعد جو حق شوہر کا اس پر ہے وہ والدین کا نہیں۔

مریم :- جی نہیں ہرگز انکار نہیں۔

حالہ :- بس تو جب یہ یقین ہے تو یہ بھی کھلی ہوئی بات ہے کہ داماد ایسے بھی گو موجود ہیں۔ جن پر بیٹے قربان ہیں تو آستین کے سانپ بھی ہیں۔ اور ما باپ کو اس سے زیادہ عمر میں کوئی خوشی ہوگی کہ بیٹے کا بیاہ ہو رہا ہے۔ کیا یہ ضرور نہیں ہو کہ وہ اس خوشی میں بیٹی اور داماد کو بھی شریک کریں۔ کیونکہ شرکت کو وہ کسی طرح لازمی اور ضروری تو کر ہی نہ سکتے تھے۔ ہاں یہ رسم مقرر کر دی کہ بہن بھائی کے سر پر آنجل ڈالے اور بھوئی دوہا بنائے۔ تاکہ داماد اس شرکت کو معمولی بات نہ سمجھے کچھ زور ان رسموں کا بھی پڑے اب اگر داماد کا اس شرکت میں کچھ خرچ ہو رہا ہے دوسرے آیا ہے تو اس کا نیک بھی مقرر کر دیا کہ ما باپ دیکھ کر کہ بیٹی داماد کا کیا اٹھا۔ اس رقم کو نہ صرف ادا کر دیں۔ بلکہ جیسا موقوفہ ہو اس بہانہ سے سلوک کریں۔ دوسری بات اور ہے دوہا گھر میں آیا۔ وہ دوہا کی حیثیت سے تمہاری رائے میں ہشاش بشاش ہو گا۔ مگر ہماری رائے میں اس کی حیثیت میں شرم بھی ہے کہ بڑی بوڑھیلوں کے سامنے دندنا تا ہوا داخل ہو گیا۔ وہ اگر تنہا ہو گا تو اس کا حجاب اور ترقی کرے گا۔ اس لئے دروازہ ہی میں برابر کی بہنیں اس کی شرم میں شریک ہو کر اس کے حجاب کو دفع کر دیں۔ ایک تیسری بات اور ہے دوہا اس سے پہلے

گھر میں نہیں آیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ دولہا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کا استقبال بھی کیا جائے گھر کا رستہ بھی بتایا جائے۔ دولہن والیاں اس وقت سائے انہیں سکتیں۔ کیا یہ معقول تدبیر نہیں ہے کہ خود بہنیں ہی اس سلسلہ میں اس کام کو انجام دے لیں۔ ایک چوتھی بات اور سنو کچھ ضرورتیں ایسی پیش آئیں کہ چپکے سے کوئی بات دولہا سے کہی ہے یا کچھ ہدایت کرنی ہے۔ کیا اس وقت کا نا پھوسی کرنا بہت ہی نہیں؟ آجکل کے ہاں سے کیا یہ ضرورت پوری نہیں ہو سکتی؟ رہی پردے کی احتیاط وہ ظاہر ہے۔ یہ ہیں تمہارے قدیم طریقے جن پر آج منہ آتی ہو۔ مجھے اس بات کا اقرار ہے کہ وہ رہیں جو خود ہماری تجویز نہیں بلکہ دوسروں سے لے کر ہم نے اپنے ہاں شامل کر لیں۔ یقیناً قابل اصلاح ہیں۔ لیکن ہمارے اپنے طریقے تو سر آنکھوں پر رکھنے کے قابل ہیں۔ اب تعلیم جو گل بھلا رہی ہے وہ ظاہر ہے۔ اس کا بڑا حصہ محض نفسانیت کی ترقی ہے۔ ابھی برسوں کی بات ہے میں تمہاری بہن کے ہاں بیٹھی تھی۔ فیہو کی ماں اتنے دنوں کی ماما تنخواہ مانگ رہی تھی بیوی دینے بیٹھیں تو چار دن کی بیماری کی تنخواہ صاف کاٹ لی۔ میں تو میرے پیٹ کی گر میں تو دنگ رہ گئی۔ سچے سات برس کی خدمت کر نیوالی۔ چار دن بیمار ہو گئی تو یہ غضب مجھ سے نہ رہا گیا۔ اور میں نے کہہ دیا "بیٹی یہ تو زیادتی ہے" فرمائی کیا ہیں "آپ اس میں دخل نہ دیجئے تو کراہی طرح درست رہتے ہیں"۔

بھلا بیوی میں یہ باتیں کیا جانوں۔ میں نے تو اماں جان کو دیکھا ہے ان کے پاس ایک ماما تھی۔ کرم بی اس کا ایک بھتیجہ تھا فضلہ۔ باپ ڈیرہ مہینہ کا چھوڑ کر مرا کوئی دو سال کا ہو گا کہ ما بھی مر گئی۔ پھر بھی کے ساتھ رہتا تھا۔ خاصا چودہ برس کا ہو گا کوٹھے پر کھڑا کنگوا اڑا رہا تھا پاؤں پھسلا اور دو متر لے سے گر کر نیچے آیا۔ عمر تھی بچ گیا۔ مگر ایک ٹانگ ایسی بیکار ہوئی کہ دنیا بھر کے علاج کر ڈالے اور کسی طرح آرام

نہ ہوا۔ بد نصیب کی ماتھی نہ باب ایک پھوپھی ہی پھوپھی تھی۔ اس درد سے رات بھر کراہتا کہ کچھ پرچوٹ لگتی۔ ڈیڈڑھی میں پڑا رہتا تھا۔ اور کوئی اتنا نہ تھا کہ نکھی تک اُڑا دے۔ رات کے وقت کرم جی جا کر تھوڑی دیر بیٹھ جاتی مگر بھائی کی اولاد اور اپنی اولاد میں یہ فرق ہوتا ہے کہ چند روز میں اگتا گئی۔ سچ کایے وارث تھا کہ دنیا کی کروڑوں مخلوق میں ایک زندہ رُوح ایسی نہ تھی کہ اس کی ٹانگ پر تیل کی لاش کر دے کرم جی بھی تل جاتی اور یتیم ایک ایک کا منہ ٹکنا اور تڑپتا۔ ایک رات کا ذکر کہ بارش ہو رہی تھی اور سہواً بعض کے زخموں پر چھریوں کا کام کرتی تھی۔ کوئی نو بجے ہوئے گئے اس نے ماں جان کو بلایا وہ سانسے کا بچہ تھا۔ پردہ نہ کرتی تھیں۔ رونوں وقت کی روٹی اور دو اکو ایک پیسہ روز دیتی تھیں۔ ایک ٹسکا اُس کے سر پر نے پانی کا اور چوکی پائنتی رکھوا دی جب وہ گئیں تو فصلو ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا:-

”بیگم صاحب آج میری حالت خراب ہے۔ ہائے اب خدا کے سوا کوئی وارث نہیں۔ میرا اگر دنیا میں کوئی سہارا ہے تو آپ کی ذات۔ مجھے شام سے سر دی بہت لگ رہی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دم نکل رہا ہے پھوپھی سے دو تین دفعہ کہا۔ نہیں سنا۔ بیگم صاحب میں کانپ رہا ہوں اپنے بچوں کا صدقہ کوئی رضائی دے دیجئے۔“ ماں جان نے اگر رضائی نکالی اور اپنے ہاتھ سے جا کر اڑھائی بات گئی گزری ہوئی۔ کوئی پندرہ دن بعد کا ذکر ہے کسی بات پر چھوٹی آپا کرم جی سے خفا ہو گئیں اور بات ایسی بڑھی کہ کرم جی اپنا اختر بخر سن بھال سیدھی ہوئی۔ چھوٹی آپا اس کا تو کچھ نہ کر سکیں۔ نزلہ برضو ضعیف جھوٹل اترسی تو غریب پر گئیں اور کہا جاتو بھی جا جب پھوپھی ہی چلی گئی تو تیرا یہاں کیا کام۔ اب ذرا اس وقت کا خیال کر لو ایک بن بابا کا بچہ۔ اپنا بیٹیم ایسا تھوڑا گھروالی کے حکم سے اس حالت میں کہ وہ کروٹ بھی شکل سے لے سکتا ہے

نکل رہا ہے۔ تم خود ہی اندازہ کر و کس طرح چارپائی سے اُترا اور چلا ایکساہشت چلتا ہے اور چپک کے مارے جان لکل نکل جاتی ہے۔ روتا ہے۔ چیختا ہے۔ چلاتا ہے اور پھر فہم کراگے بڑھتا ہے۔ تین چار گھنٹے میں شکل سے دس بار گڑ چلا ہو گا۔ رات چاندنی تھی اور موسم سرد بر نصیب لحاف لے جا سکا نہ چادر۔ ماہتاب نے مظلوم یتیم کو آغوش میں لیا۔ دُش شے ہوں گے کہ آبا جان آئے اور آتے ہی پوچھا کہ ”فضلو کہاں ہے“۔ چھوٹی آپائے کہا کدھ بی نکل گئی ہیں اُس کو بھی نکال دیا۔ وہ تو یہ کہہ کر خاموش ہو گئے کہ بہت بُرا کیا۔ ماں جان نماز عشا پڑھ رہی تھیں۔ اور اُن کی نماز کا یہ حال تھا کہ مجھے یاد نہیں اُنہوں نے نماز کے آگے کسی چیز کی پروا کی ہو۔ یہاں تک کہ تمہاری اما کے مرنے کا تاہ آیا۔ بیماری کی خبر پہلے سے تھی۔ سب گھبرا گئے۔ مگر اُنہوں نے نماز نہ چھوڑی۔ مگر یہ سنتے ہی کہ فضلو کو نکال دیا اُنہوں نے سلام پھیر کر اتنا تو کہا:-

”ہے ہے کم بخت یہ کیا ظلم کیا“

اور برقع ہاتھ میں لے ڈیوڑھی میں آئیں فضلو موڑ پر بڑا سکر دھا تھا۔ پیچھے مڑ کر دیکھتی ہیں نو آبا جان۔ رات خاصی آگئی تھی۔ سڑک پر سناٹا تھا ان سے چارپائی پکڑوائی اس کے پاس گئیں جگایا اور چارپائی پر لٹا کر لائیں۔ آبا جان چلے آئے وہ اس کے پاس بیٹھیں۔ میں ہاں گئی۔ فضلو کی نگاہ آبا جان کے چہرے پر تھی۔ اس میں کیا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتی۔ مگر اتنا کہہ سکتی ہوں دنیا کی بیش قیمت سے بیش قیمت شے اس کی برابری نہیں کر سکتی۔

لوہی مریجہ! چلو! جلدی کرو۔ میں تم کو ساتھ لے کر جاؤں گی۔  
چھوڑ دوں گی نہیں۔

ہمارِ قدامت فہم ہو چکی۔ غریب رشتہ داروں کا مان رکھنے والیاں

قبروں میں جا سوتیں۔ اب انسانیت کا دور دورہ ہے۔

تقریر کا اثر تھا یا وعظ کا نتیجہ مایٹوں کے خیالات کا جو اثر ساجد پر پڑا تھا ایسا زائل ہوا کہ چھینٹ بھی نہ رہی اور ایسی حالت میں ساجد کی زندگی سنا اور میاں دونوں کے واسطے خاصی مصیبت تھی۔ میاں کی زبان سے برسوں خدا کا نام نہ نکلے بیوی قدم بھی اٹھاتی تو بسم اللہ کہہ کر۔ باوجود اس عزت اور خدمت کے جو خدا نے اس کو دی۔ وہ میاں کی محبت۔ ساس کی عنایت اور اپنی حالت کو نہ بھولی۔ کھانسی، بخار، درد، کوئی تکلیف ہو۔ مگر یہ ممکن نہیں کہ نماز ناغہ ہو جائے۔ کڑکراتے جاڑوں میں بیماری کی حالت میں ٹھنڈے پرف پانی سے وضو منظور۔ مگر نماز کا نہ پڑھنا تو کیسا قصا پڑھنا بھی منظور نہیں۔ ضمیر نے اپنی طرف سے بہت سمجھایا۔ مگر اُس نے نماز نہ چھوڑی۔ قیاس چاہتا ہے کہ اس نماز مانی کی نماز ساجد کا کو یہ امتی کہ ضمیر اس کی صورت سے بیزار ہو جاتا اور یہ دیکھ کر کجنت اسی جہالت کا پینٹنا پیٹے جا رہی ہے۔ بات تک کرنی چھوڑ دیتا۔ مگر ایسا نہ ہوا اس سرتابی پر بھی ضمیر اس کی صورت کا دیوانہ تھا۔ اور اگر یہ نہ کہا جاسکے کہ ساجد کا خدا اس کے ساتھ تھا تو اس کہنے میں کیا تاویل ہوگا کہ زبیر پہن کر اور پہنچ بھر کر فاقے اور مصیبت ہمیشہ اس کے پیش نظر رہے۔ اس نے جس طرح تکلیف کو عارضی اور اذیت کو فانی سمجھا اسی طرح راحت کو چھاول اور مسرت کو چاندنی۔ افسوس یہ ہے کہ مغلانی دنیا کی راحتوں کو جلد ختم کر گئی۔ وہ کم سے کم یہ دیکھ لیتی کہ لاپرواہی کے جو بیج وہ گھر میں بو رہی ہے۔ یہ آئندہ نسلوں تک کو غارت کر کے بھی پیچھا چھوڑنے والے نہیں کچھ ایسی بڑھیا بھی نہ تھی۔ پچاس باون برس کی عمر۔ بندھی ہوئی کاٹھی۔ گٹھا ہوا بدن۔ آدھ سیر بالائی مرتے مرتے ناغہ نہ ہوئی میرنے کی عمر تھی نہ اندیشہ، دیکھ نہ بیماری، غامی اچھی بھلی جنگی۔

کلبے آئی جون کا مہینہ تھا۔ گرمی نواتے کی پڑ رہی تھی کچھ رستے کی ٹھکان کچھ واقسی جس آتے ہی نہائی۔ تہا کراٹھی بیٹھی باتیں کر رہی تھی کہ بخار چڑھا اور ساتھ ہی سینہ میں درد۔ اسی وقت ڈاکٹر لیڈی ڈاکٹر ہندوستانی ڈاکٹر گورا ڈاکٹر سب جمع ہو گئے۔ تین دن اور تین رات اسی طرح پڑی رہی جو تھے دن حالت بگڑ گئی۔ ہو تھی تو پرائی جانی۔ مگر ساس کی پٹی لمحہ بھر نہ چھوڑی۔ بچا ست۔ صبر دل او۔ تھوک امت کر دیا۔ بھر بھر روال بغم کے اپنے ہاتھ سے پھینکتی اور تپوری پر پل نہ آتا وہ جس کا کام تھا۔ اُس اللہ کے بندے یعنی صہیر نے ذہا پر دانہ کی بیجوں کی طرح دونوں وقت آیا۔ کھڑے کھڑے خیر صلاح پوچھی اور چلتا ہوا۔ ماتر پ رہی ہے اور پلک رہی ہے۔ مگر اس کے کان پر جوں نہیں ہلتی۔ حد یہ ہے کہ ماکا جنازہ احاطہ میں پڑا رہا۔ مگر وہ جب تک کنگھی۔ برش۔ کوٹ پتلون سے فارغ نہ ہو گیا۔ باہر نہ نکلا۔ بی مخلصی کو آخری وقت معلوم ہوا کہ جس صورت کی دیوانی اور جس لال کی پروانہ تھی وہ بھی اپنا نہ تھا۔ چوتھے روز جب حالت زیادہ خراب ہوئی تو اُس نے بیٹے اور بہو دونوں کو بٹھا کر کہا:۔

”اب میں دنیا سے رخصت ہوتی ہوں۔ لیکن اس خیال سے خوش ہوں کہ گھر اس عورت کے سپرد ہوتا ہے جو اس وقت کنبہ بھر کا مول ہے۔ میں خوش نصیب تھی کہ خدا نے مجھ کو ایسی بہو دی اچھا بیوی میرے پاس آؤ۔ میرے گلے لگو۔ کہیں تمکو خدا کے سپرد کروں۔“

ضمیر ماکا یہ گفتگو سن کر مسکراتا ہوا باہر چلا گیا۔ مگر ساجدہ کی آنکھ سے آنسو گرنے لگے۔ وہ روتی ہوئی بڑھی۔ ساس کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ تسکین دی۔ ضمیر کو گئے مشکل سے آدھا گھنٹہ ہوا ہو گا کہ ماؤنیا سے رخصت ہوئی

## چوتھا باب

جیسا دیس ویسا بھیس! وہی گھر تھا اور وہی گھر کے لوگ۔ مگر ایک ساجدہ نے حالات میں آسمان وزمین کا فرق کر دیا اور سوا خمیر کے کوئی متنفس ایسا نہ رہا جو صبح اٹھتے ہی سب سے پہلے نماز اور تلاوت کلام اللہ کرتا ہو۔ مخلانی خدا اس کی روح کو نہ شرمائے خسیں نہ تھی خیرات بھی کرتی تھی اور زکوٰۃ بھی دیتی تھی۔ مگر اس کی ذات سے صرف خوشامدیوں کو فائدہ تھا جس لئے اگر دو باتیں ملائیں اور جھوٹی سچی خوشامدی اسی کا کام بن گیا۔ ساجدہ دینے میں ساس سے بڑھی ہوئی تھی مگر موقعہ دیکھ کر اور حالت پہچان کر۔ بے نمازن عورت سے تو وہ بات تک نہ کرتی اور تو اور حد یہ ہے کہ اگر دو چار دفعہ میاں کی انٹی سیدھی سن لیتی تو ایک آدھ دفعہ اپنا چھوٹا سا وعظ اس کو بھی سنا ڈالتی۔ مختصر چند ہی مہینہ میں ضمیر کا گھر ساجدہ کی بدولت خاصی چھوٹی سی مسجد بن گیا۔ ہر طرف سے اللہ رسولؐ کی آوازیں آتی تھیں۔ میاں بیوی میں سلوک اور محبت اختلاف جو جو کچھ ہونا چاہیے۔ سب ہی کچھ تھا۔ مگر خیال کی مخالفت کسی طرح کم نہ ہوتی تھی اور گو اس اختلاف نے کبھی لڑائی کی صورت اختیار نہ کی۔ مگر خفیہ سی بد مزگی اکثر ہو جاتی اور وہ اس طرح کہ ضمیر ہوا خوری کو تیار کھڑا ہے۔ بیوی سے رد مال مانگا۔ وہ اللہ کی بندی سجدہ میں پڑی ہے۔ مجبور خود ڈھونڈ کر نکالا یا سہلا ہی لئے کر جانا پڑا۔ ساجدہ کو شرعاً ایسا کرنے کی مجاز تھی۔ مگر اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس نے ہمیشہ اس کو محسوس کیا۔ اور یہ کوشش کی کہ خدا کے فرض کی ادائیگی شوہر کی خدمت میں رخنہ نہ ڈالے۔ ضمیر کو بھی اس کا پتہ تھا



اور اسی وجہ سے وہ بعض دفعہ ہر قسم کی تکلیف برداشت کر لیتا تھا۔  
 دنیا میں کچھ بھی ہوا کرے۔ مگر قدرت کا قانون خاموشی کے ساتھ  
 اپنا کام کرتا ہے۔ مغلانی کو مرے شاید ڈیڑھ یا پونے دو سال ہوئے ہونگے  
 کہ ساجدہ ایک بچی کی ماں بن گئی اور دوسرے ہی سال دوسری بچی کی۔ یہ  
 دونوں بچیاں زاہدہ اور شاہدہ اگر دادی کی زندگی میں پیدا ہوتیں تو شاید ساجدہ  
 ایک خاص حد تک ان کی پرورش سے سبکدوش ہو جاتی۔ لیکن اب ماتھی تو وہ اور  
 دادی تھی تو وہ۔ ضمیر اپنے خیالات میں ہمیشہ مست رہنے والا شخص تھا اتفاق کی  
 بات ہے ایک روز وہ مغرب کے وقت ٹینس کھیل کر آیا تو بیوی بڑی بچی کو گود میں  
 لئے باہر کھڑی تھی زاہدہ اس وقت خاصی ڈیڑھ برس کی تھی باپ کو اچھی طرح  
 پہچانتی تھی۔ ہلک کر ہاتھ پھیلے۔ باپ کا خون بھی جوش میں آیا اور گود میں لے  
 اور ہلنے لگا۔ ڈیڑھ برس کی بچی کی بساط کیا تھی۔ ٹوپی کا پھندا دیکھ کر باغ  
 باغ ہو گئی اور پکڑنے لگی۔ ٹوپی باپ کے سر سے اتر کر بچی کے ہاتھ میں آئی اور  
 زمین پر گر کر مٹی میں بھر گئی۔ غلطی خود ضمیر کی تھی جیسے بچی نے ٹوپی لی تھی نہ لینے  
 دیتا یا لے کر پھر اڑھ لیتا اس وقت تو خاموش ہو گیا۔ مگر جب نیچے گری اور مٹی میں  
 بھری تو البتہ تیوری پر بل آ گیا اور یوں کی یوں ہی مٹی میں سخی کچھ میں بھری ٹوپی  
 لے بچی کو اور ٹوپی کو بیوی کے سامنے لاکر پھنک دیا اور کہا ڈیڑھ برس کی بچی اس کو طلب  
 کے لئے دنیا بھر کی باتیں بگھارنے کو موجود۔ کھانا پے مانگے۔ پانی یہ طلب کرے۔ کیا  
 اسے مانگتی آئے مگر ٹوپی کو ٹوپی نہ سمجھے۔ لیکن اس میں محصوم کا کیا قصور جیسا  
 اٹھایا ویسی اٹھی۔ جیسا سدھایا ویسی سدھی۔ بچہ ماں کے پیٹ سے کچھ سیکھ  
 نہیں آتا۔ جس رستہ پر ڈال دیا پڑ گیا۔ تم جیسی قابل ماں کی گود سے جو زمانہ  
 کو بچا نے نہ وقت کو دیکھے جتنے بدتمیز اور پھوٹے پیدا ہوں۔ درست اور

ٹھیک - خیر ایک کاستیاناں تو ہوا تم جانو اور یہ بد نصیب جانے۔ اس کی تھڑ پر پھوٹی تھی پھوٹی - مگر مہربانی فرما کر چھوٹی کی پرورش میں دخل نہ دینا۔ جس طرح میں چاہوں گا پال لوں گا اور پلوں گا۔

ضمیر کا اتنا اشارہ ساجدہ جیسی عورت کے لئے کافی بلکہ کافی سے بھی زیادہ تھا۔ اس نے میاں کی بات گرہ میں باندھ لی اور شاہدہ سے دو دو کے سوا کوئی واسطہ نہ رکھا۔ باپ نے ایک نرس اور ایک کھلائی مقرر کر دی تھی۔ دن رات ان کے ہی پاس رہتی۔ صبح اپنے سامنے اس کو غسل کرانا۔ کپڑے بدلوانا۔ ناشتہ کروانا۔ دوپہر کو اپنے روبرو اس کو سبق دلوانا۔ پچھلا سنا آگے پڑھوانا۔ شام کو اپنے ساتھ ہوا خوری کو لے جانا۔ سیر دکھانا۔ لکچر سنانا۔ باتیں بتانا۔ آنکھ بند کر کے دن نکل گئے زاہدہ دسویں اور شاہدہ نویں سال میں تھی۔ کہ ایک روز شام کے وقت ضمیر شاہدہ کو لئے سیر سے واپس آ رہا تھا۔ نرس بھی ساتھ تھی۔ برج کے پاس آ کر گھوڑا بھڑکا اور اس بُری طرح کہ نہ اپنے سے رُکا نہ سائیس سے کھما۔ خدا کو کچھ بہتری کرنی منظور تھی۔ کہ جلدی سے ضمیر نے چچی کو نرس کی گود میں ڈپا۔ وہ پیچھے بیٹھی تھی جھٹ سے بچی کو لے کر دپڑی۔ گھوڑا اسی طرح چمک رہا تھا۔ مارا چمکا راڈا نسا ڈپٹا۔ مگر قابو میں نہ آیا۔ مجبور خود ضمیر بھی باگ چھوڑ کر دوڑا۔ الگ جا کھڑا ہوا۔ ضمیر کے کودتے ہی گھوڑا گاڑی سمیت نالی میں گھوڑے کے بھی چوٹ آئی۔ گاڑی بھی چوڑا ہو گئی۔ مگر جان بچی لاکھوں پائے۔ ضمیر کی نگاہ میں اس واقعہ کو خدا سے مطلق واسطہ نہ تھا۔ اس نے نرس کو جو عیبائی تھی۔ سلاستی پر بہت بہت مبارکباد دی۔ چچی کو اٹھا کر پیار کیا۔ مڑ کر دیکھتا ہے لڑکے کے درخت کی جڑ میں ایک اپانچ اپنے زخم کبیل سے چھپائے پڑا ہوا ہائے ہائے کر رہا ہے۔ تیور سی پر بل ڈال کر آگے بڑھنا چاہتا تھا کہ اپانچ نے کہا:-

”کچھ دے“

ضمیر کو سخت اور شاہدہ کو بہت ہی سخت ناگوار ہوا۔ ابھی باپ کچھ کہنے نہ پایا تھا کہ شاہدہ بولی ”کس قدر بد تہذیب آدمی ہے۔ ہم سے مانگنے کا اسے کیا حق حاصل ہے۔“

ضمیر ”ان لوگوں میں بیکار رہتے رہتے یہ عادت پیدا ہو جاتی ہے کہ اپنے کام بھی دوسروں پر ڈال دیں۔ کم بخت اپنا حق سمجھتے ہیں اسی واسطے لندن میں بھیک مانگنے کا حکم نہیں ہے۔ ہر شخص خواہ کتنا ہی غریب کیوں نہ ہو محنت کرے اور پیٹ پالے۔“

شاہدہ ”ان کی اس بے حیائی کے ذمہ دار ہم ہی ہیں اگر ان کو بھڑک دیں اور ان کو خود مصیبت اٹھانی پڑے تو یقیناً انکی عاداتیں چھوٹ جائیں لیکن اسکی کیا علاج کہ ابھی کوئی بیوقوف مسلمان ادھر سے نیکلے گا تو پیسہ کیا کھانا تک ان کو کھلا دیکھا۔“

ابا بیج ”آپ میرے قریب آئیے میرے زخموں کو ذرا دیکھئے۔ مجھے سخت تکلیف ہے۔ بھوک کے مارے مر رہا ہوں۔ ہونٹوں پر سپرٹریاں بندھی ہوئی ہیں اور کل شام سے پانی اور کھانے کو ترس رہا ہوں اب میری حالت رحم کے قابل ہے۔ مجھ میں اتنی طاقت نہیں کہ ہل سکوں بخار چڑھا ہوا ہے، کروٹ لے نہیں سکتا۔ میں نے آپ کو مسلمان سمجھ کر پیسہ مانگا تھا۔“

ضمیر ”تیرے زخم دیکھ کر اپنی طبیعت بگاڑوں حالانکہ اس کے خیال سے میرا جی متلائے لگا۔ تیری نبض دیکھوں۔ بخار کا پتہ لگاؤں۔ چاہے وہ مرض متعدی ہی کیوں نہ ہو۔ تیرے جسم کو ہاتھ لگاؤں خواہ خود ہی میرا ہمار پڑ جاؤں۔“

شاہدہ ”چلیے بابا چلیے اس سے بات مرنے کی ہے۔“

گٹھڑی ٹوٹ چکی تھی اور سائیس بھی زخمی ہوا تھا۔ دونوں باپ بیٹیاں اور بھائیوں

پیدل گھڑے۔ ساجد کا نے جب یہ واقعہ سنا تو میاں سے یا بیٹی سے تو کچھ نہ کہا۔ وضو کر دو نفل شکرانہ کے پڑھے اور اسی وقت دس بچوں کا کھانا یتیم خانہ میں بھیجا آدمی کھانا لے جا رہا تھا کہ خمیر نے بھی دیکھا۔ ہنسا اور بیٹی سے کہا تم دیکھ رہی ہو تمہاری جاہل مایا تم شے دکھا رہی ہیں۔

نشا ہر ۵۔ ”جی ہاں وہ ان تمام باتوں کو خدا کی طرف سے سمجھتی ہیں۔“  
 ختم پیر۔ ”مگر کوئی اس نیک بخت سے پوچھے کہ بیوقوف ان باتوں کا خدا سے واسطہ کیا۔ اگر جان خدا نے بچائی تو گھوڑے کو بھی اسی لئے بھڑکایا۔ فرض کرو یہاں نہ کویتا اور تم کو نہ رس لیکن نہ اتر جاتی تو کیا تمہاری ماں کا خدا اس وقت بھی بچا لیتا۔ افسوس یہ ہے کہ جاہل ماننے بڑی بچی کا بھی اپنے ساتھ ماس کیا میں دیکھتا ہوں کہ وہ خیالات کے اعتبار سے دوسری ماہی وہی جہالت وہی تعویذ اور وہی حقائق۔“  
 اس واقعہ کو تیسرا مہینہ ہوا ہو گا کہ جاڑوں کے موسم میں ایک روز دوپہر کے وقت ساجد کا کوٹھے پر نماز ظہر دیکھو پیسا میں پڑھ رہی تھی۔ اور ڈاھڈا ساتھ تھی۔ دونوں ماہیلیاں نماز پڑھ چکیں تو ساجد نے نیچے کے گھروں میں ایک نظر ڈالی خمیر کی کوٹھی کے پاس ایک چھوٹا سا محلہ آٹھ گھرے کے نام سے مشہور تھا جس میں کچھ غریب اور یہ نصیب لوگ اپنی زندگی بسر کرتے تھے۔ ساجد کی نظر ایک بیمار پر پڑی جس کے سر پرانے ایک عورت بھی آٹھ آٹھ آنسو رو رہی تھی۔ مریض کا مکان دیوار سے ملا ہوا تھا۔ اور دالان جہاں مریض کا بستر تھا بالکل آنکھ کے سامنے اس میں صرف نین تین تھیں ایک بڑھیا ایک رانڈ دوسری کواری بیٹی۔ ان کے سر پر کوئی مرو نہ تھا اور بسر اوقات کا سلسلہ درزی کی سلائی اور گوشت کی مزدوری تھی۔ شریف لوگ زمانہ کو جاننے اور وقت کو پہچانتے تھے۔ جو پڑی وہ چھلی جو آئی وہ اٹھائی۔ جو میسر آیا وہ کھا لیا جو لگیا وہ بھر لیا۔ بڑھیا تھی تو غریب بلکہ فقیر مگر اس آن کی عورت اور شان کی آدمی کو سوال

یا طبعی تو درکنار یہ سن کر اور سمجھ کر کہ ساجدہ کے ہاں خیرات ہو رہی ہو۔ کبھی گھر کی ہوا تک نہ مچکنے دی۔ ساجدہ کھٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ بڑھیا جانماز پڑھتی اور بیڑہ بہن کو اسی بہن کے پاس خون کے آنسو گرا رہی تھی۔ اس کی مفارقت کا خیال اسکی موت کا یقین اس کی وداع کا احتمال کیلئے پر برے لگا رہا تھا۔ سردی سخت تھی اور ہوا تیز۔ شام قریب تھی، اور رات سر پر بیمار بچی جس کے بدن پر اب بھی ایک بیٹی سی دلائی کے سواروئی کا کپڑا نام کو نہ تھا۔ نمونیا میں سہوش پڑی تھی۔ ماٹھی اور دوا کے بدلے اس کا منہ کھول کر دعام کی۔ آنکھ سے آنسو کی لڑیاں بہہ رہی تھیں۔ دوا کیوڑے پیسہ پاس نہ تھا۔ رات تینوں دھولوں پر بھان بھل چکی تھی۔ اور دن بھی اس فاقہ میں ختم کے قریب تھا کہ بیمار نے آنکھ کھولی اور کہا بھوک لگ رہی ہے۔ کیلچہ بچ رہا ہے۔ دو چمچے دودھ کے دید و مانے بیٹی کی آواز سُنی اور قریب پہنچا کہ اسے منہ پر ہاتھ پھیرا اور رو کر کہا بیٹی پیسہ نہیں ہے رات سے اللہ ہی اللہ ہے بیمار نے کچھ جواب نہ دیا کہ درزی نے آکر کہا "لاؤ گرنہ دے دو۔"

پرٹھویا۔ "بھائی ابھی نہیں ہوا۔ بچی بیمار ہے۔ اس کی بیماری میں دنوں لگے ہوئے ہیں اللہ جیسے کل ضرور لے جانا۔"

درزی۔ "کل بکرتے والا میلہ میں کیا پہن کر جائے بچی بیمار ہے تو جوئی کے صدقہ سے یہ پیسہ جو پہلے دیدے وہ مفت کے تھے۔ تم ہوڑی بے غیرت کہ زبانی باتوں کا اثر ہی نہیں ہوتا۔ لاؤ میں میرا گرنہ یوں کا یوں ہی دے دو اور اب شریف ہو تو مجھ سے کپڑا نہ لینا۔"

پرٹھویا۔ "بیٹا تصور تو ضرور ہو گیا مگر معاملہ ایسا ہی تھا۔ بچی کے بچنے کیلئے نہیں ایک پیسہ دوائی ٹھنڈائی کو نہیں۔ کچ رات کو جس طرح ہو گا برسی سے تیار کر دوا دی گئی۔"

درزی۔ "بس زیادہ باتیں نہ بناؤ انہیں بڑی نمازی۔ پرہیزگار۔ دنیا بھر کی بھونٹی

مکڑا سید سے ہاتھ سے کرتہ اور دو آنے کے پیسے ادھر رکھ۔

بڑھیا: بیٹا پیسہ تو ہے نہیں کرتہ حاضر ہے چاہے چھوڑو چاہے لے جاؤ۔

درزی: میں نے تجھ جیسی سینکڑوں دیکھ لی ہیں۔ پیسے ادھر رکھ دے۔

بڑھیا باتیں کر رہی تھی کہ بڑی بچی نے گھبرا کر آواز دی اے بی ماں۔ ادھر تو

آؤ دیکھو تو وہی اسے کیا ہو رہا ہے اس کے تو ہاتھ پاؤں مڑ رہے ہیں۔

بڑھیا: ہائے کیا کروں۔ اے بچی خدا کے لئے کچھ تو کھول۔ ننھی لے

پانی تری۔ اس کے دانت بند ہو گئے۔ پانی کیوں کر ڈالوں؟ چچھی بھی تو نہیں ہے۔

درزی: چچھی کی بچی میں تیرے دادا کا نوکر ہوں کہ دکان چھوڑے تیرے

گھر پر کھڑا ہوں راجلدی سے کرتہ اور پیسے۔

بڑھیا: بیٹا اللہ کی قسم پیسے تو نہیں ہیں کرتہ لے لو۔ یہ طشتری لے لو

دو آنے کے بدلے۔

درزی: دیکھو اب یہ طشتری تو چار پیسے کی بھی نہیں ہے۔ رنگ میں

ڈوبی رنگ میں لتھری ہے کس کام کی۔

بڑی لڑکی: اچھی ماں خدا کے واسطے آؤ یہ تو منہ کھول رہی ہے۔

پانی تو ٹپکا دو۔

بڑھیا: بیٹا میں اور پیسے تم کو دیدوں گی۔ تم اب جاؤ۔

درزی کرتہ اور طشتری لے کر اُدھر گیا۔ بڑھیا ادھر آئی تو مٹی کے آبخورے سے پانی

بچی کے حلق میں ڈالا۔ ساجدہ اوپر کھڑی یہ تمام واقعہ دیکھ رہی تھی۔ اور زاهد کو دکھا

بھی رہی تھی۔ جب پانی پیار کے حلق سے زیادہ اُس کے اوپر گرنے لگا اور اُس نے کراہنا

شروع کیا۔ تو وہ بچی کو لئے نیچے اُترتی تو ضعیف بیٹھا ہوا شاہد سے کھیل رہا تھا۔

بیوی: میں ذرا اٹھ گھرے تک جانا چاہتی ہوں، ہو آؤں؟

ضمیر۔ "کیوں خیریت۔ وہاں جانے کی کیا ضرورت ہوئی؟"

بیوی۔ "نیم والی بڑی بی کے ہاں جاؤں گی۔"

ضمیر۔ "وہ فقیرنی ٹکر گدھی مغرور اتنی کہ بھوکی رہے اور یہاں آکر جھانکے

تک نہیں وہاں تمہارا جانا ہرگز تمہاری شان کے لائق نہیں۔"

بیوی۔ "یہ ٹھیک ہے مگر اس وقت تو تم مجھ کو اجازت دے دو۔"

ضمیر۔ "ایسی ہی ضرورت ہے تو چلی جاؤ۔ مگر اپنی عزت کو خود نہ سنبھالو گی

تو یاد رکھو کروں تک کی نگاہ میں ذلیل ہو جاؤ گی۔ اس کا تو نسب کھل جائے گا۔

تو تم وہاں گئیں مگر تمہاری عزت میں فرق آئے گا۔"

بیوی۔ "تم اجازت دے رہے ہو تو اس بحث کو جانے دو۔"

ضمیر۔ "اچھا جاؤ چلی جاؤ۔"

بیوی۔ "تم ذرا ڈاکٹر کو بلا دو اور وہیں بھیج دینا۔" ڈولی منگوا چکی تھی

بٹھا بڑھیا کے پاس آئی۔ دروازہ میں کھڑے ہو کر پوچھا "میں آ جاؤں؟"

دولوں مابیناں سکتے میں رہ گئیں۔ آخر بڑھیا نے کہا "ہاں بیگم آ جاؤ۔"

ساجدہ اندر پہنچی تو بیٹھنے کو کوئی جگہ نہ تھی۔ بڑھیا نے ایک کراپنا برقعہ بچھا دیا۔

اور کہا بیگم اس پر بیٹھ جاؤ۔ ہمارے ہاں کوئی چیز آپ کے لائق تو ہے نہیں آپ نے

مجھے وہیں بلوایا ہوتا۔ میں آجاتی آپ نے کیوں تکلیف کی۔"

ساجدہ۔ "تکلیف کی کیا بات ہے یہ چھوٹی بچی کیا بیمار ہے؟"

بڑھیا۔ "بیوی کیا بتاؤں اگلے جمعہ کو صبح کی نماز خامی اچھی طرح پڑھی۔

سر جھٹ رہا تھا۔ کہنے لگی "تہا لوں" میں نے کہا "اچھا" ٹھنڈے پانی سے نہانی نہ کر

اٹھی تو پسلی میں درد تھا۔ پھر بخار چڑھا۔ جب سے میں ہی بے سرت پڑی ہے۔"

ساجدہ۔ "آپ نے کچھ دوا وغیرہ پلائی؟"

## برٹھیا

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ڈاکٹر آگیا۔ پردہ ہوا۔ دیکھا۔ نسخہ لکھا۔ دوا آئی اور اپنے سامنے دو دو گھنٹے بعد ساجد نے دو خوراکیں پلائیں۔ چلتے وقت دیکھتے نظر آئے۔ نقد دینے اور کہا میں صبح ہی پھر آؤں گی۔

جس وقت ساجد اور زاہد ڈولی میں بیٹھے لگیں تو برٹھیا پاس کھڑی تھی۔ شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی۔ مگر زبان نہ اُٹتی تھی۔ آنسوؤں کا ایک تار بھا جو ساجد کی عنایت کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ شام کو سب سے پہلے چار آدمیوں کا کھانا سیر پھر دودھ اور تین لٹات برٹھیا کو بھیجے۔ دوسرے روز جب ساجد گئی ہے تو بیمار کی حالت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ہفتہ پھر تک برابر دوا جاری رہی اور لڑکی تندرست ہو گئی۔ برٹھیا نے ساجد سے تو کچھ نہ کہا۔ مگر اس کی ماسے جاکر جو کچھ کہا اس کا اثر اتنا ہوا کہ اُس نے فوراً بیٹی کو یہ خط لکھا :-

"ساجد بیٹی کو ماں کی طرف سے بہت بہت دعا۔ آج نیم والی بڑی بی آئی تھیں جس طرح انہوں نے تمہاری تحریفیں میرے سامنے کہیں اور جس دل سے دعائیں دی تھیں۔ میں تمہارے سامنے بیان نہیں کر سکتی۔ کیا بتاؤں کس قدر خوشی ہوئی ہے۔ انسانیت کے یہ ہی سخی ہیں اور دولت کی یہ ہی تعریف ہے کہ حاجتمندوں کے کام آئے اور مفلسوں کو بددوسے۔ زندگی اسی کا نام ہے اور اسلام اسی کو کہتے ہیں۔ کہ انسان ہر رنگ میں اور ہر حال میں موت سے غافل اور انقلاب سے بے خبر نہ ہو۔ تم لگیں تمہارا جانا معمولی بات تھی۔ مگر نہیں تم نے ایک دل فتح کیا۔ ایک مسلمان کے کام آئیں۔ تم نے ایک جج کیا۔ ایک گتے ہوئے مکان اور ایک اُبڑے ہوئے دل کو تعمیر کیا۔ آباد کیا۔ تم نے دنیا کو



نہ دیکھا ہو لیکن تمہارے ہر قدم پر تمہارے ہر سانس پر ایمان کے فرشتے مرجھا کے نعرے لگاتے تھے۔ تم نے ایک قرض تم نے ایک امانت اس کو دی اس کے پاس رکھوادی جو سچا مہاجن اور پورا امین ہے اور جس وقت ہر تنفس نفسی پکار رہا ہو گا تمہاری یہ خدمت تمہاری یہ امانت تم کو واپس ملے گی۔ تم بڑھیا سے بہت زیادہ عاجز مند ہو گی۔ پیار سے بہت بڑھ کر مضطرب ہو گی۔ یہاں تین عورتیں ایک گھر میں تھیں۔ وہاں سب ہوں گے اور کوئی نہ ہو گا۔ مجھ جیسی ماں جو صورت کی عاشق دار ہے منہ پھیر لے گی اور ساجد جیسا باپ جو مرتے مرتے گلے لگاتا رہا آٹھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے گا۔

پیارمی بیٹی تمہاری ہستی کیا تھی۔ اس حکم الحاکمین نے اپنی قدرت سے اپنی عنایت سے تم کو دولت دی۔ بیگم بنایا۔ کیوں اس لئے کہ دولت دے کر دیکھے۔ اور حکومت دے کر آرائے۔ جو کر ہی ہو اس میں فرق نہ آئے اور جو سمجھ رہی ہو اس میں کمی نہ ہو۔ زندگی کے ساتھ موت۔ صحت کے ساتھ علالت، تمول کے ساتھ عشرت لازمی اور یقینی ہے کوئی فعل ایسا نہ ہو جائے کہ بعد میں پچھتاؤ۔ سُنّتی ہوں کہ نماز گنڈے دار ہو گئی۔ خدا کی قسم ساجد کا بہت رنج ہوا۔ میرے دودھ کو یہ آگ لگی کہ مسلمان کی بچی۔ ہٹی کٹی موٹی تازی اذان سنئے اور پان کھائے۔ یہ عزت ہمیشہ یہ دولت سدا اور یہ زندگی زیادہ دیر رہنے والی نہیں۔ موت سر پر موجود ہے اور پہنچا ہے اس گھر میں جہاں عزیز اور غیر کوئی بھی کام نہ آئے گا۔ اندھیرا

گھسپ ہو گا۔ سانپ بچھو۔ کیرے۔ کھنکھورے اس جسم کو جو جن  
 خدا کے سامنے بھگتے ہوئے ہی پکپاتا ہے جھلنی کر دیں گے۔ وہاں یہ  
 نہ تو ہی ایسی چیز ہوگی جو اندھیرے کو اجالا اور قبر کو روشن کر دیگی۔  
 دنیا کے بہت سے مرحلے دیکھ لئے کو اپنے سے دہن بنیں۔ پیوستی  
 مابین۔ لڑکی سے گھر والی بنیں۔ لیکن ابھی کچھ اور بندنا ہے اور  
 وہ سب سے پیچیدہ اور سب سے نازک مسئلہ ہے۔ سا جیڈ  
 اس وقت کو نہ بھول اور تیار رہ ہر وقت اس امتحان کے۔ اس  
 جواب کے۔ اس عذاب کے واسطے جو موت کے ساتھ ہی شروع  
 ہو جائے گا۔

## پانچواں باب

ضمیر شاہدہ کی پرورش میں دن رات مہمک تھا اس نے اپنی دانستہ میں  
 اپنی بساط کے لائق اور اپنی حیثیت کے موافق کوئی کسر نہ چھوڑی۔ کھلاسنے  
 کے واسطے نرس۔ پڑھانے کے واسطے مس۔ مشن میں تعلیم اس نے دلائی میمنوں  
 کی صحبت میں اس نے رکھا۔ مختصر یہ کہ صبح سے شام تک صرف تعلیم کی کوشش اور  
 اصلاح کا ضبط تھا۔ ماسے اس کا واسطہ ہمیشہ ہی برائے نام رہا۔ ہشیار ہوتی  
 تو بس اتنا تعلق ضرور تھا کہ مدرسہ جاتی دفعہ اور آتی دفعہ کھڑے کھڑے دوچار  
 باتیں۔ ورنہ ایک علیحدہ کمرہ جو باپ نے اس کو دیا تھا اور تاکہ کر دی تھی کہ  
 بلا اجازت کوئی نہ جانے پائے۔ رات بھر اس میں رہتا اور جو جی میں آئے وہ پڑھتا۔  
 بر خلاف اس کے زاہد مائی دوسری تصویر تھی۔ غرض ایک بیٹی باپ کی اور ایک مائی۔

یہ ضمیر کی کھلی ہوئی زیادتی اور علانیہ حق تلفی تھی کہ چھوٹی پرائیڈیاں اٹھاتا اور اُٹ نہ کرتا۔ اور بڑی کو چھوٹی کو ڈی نہ دیتا اور ہر وقت جلتا۔ اس کی عادت اس کی خصلت اس کی باتیں اس کی صورت ہر چیز ظالم کو زہرِ معلوم ہوتی تھی۔ شاہد کے ساتھ ساجد کا یہ سلوک نہ تھا اس کو دونوں آنکھیں ایک تھیں۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ جو چاہے کھا سکتی اور منگو سکتی ہے۔ لیکن جب اس نے کسی چیز کا حتمہ کیا تو وہی شرعی آدھا اس کو آدھا اس کو۔

زاہدہ چودھویں اور شاہد تیرہویں برس میں تھی کہ ایک روز شاہد کو اپنے کمرہ میں ڈر لگا۔ سوتے سوتے کچھ ایسی ہیبت بیٹھی کہ گھگھی بندھ گئی۔ کمرہ کبلا تھا ما اتفاق سے جاگ رہی تھی۔ اُٹھی گئی دیکھا تو واقعی بچی تھر تھر کانپ رہی ہے ہیشیا کیا توجاگی۔ مگر ڈر کچھ ایسا بیٹھا تھا کہ بات نہ کر سکتی تھی۔ میاں کو بلوایا تو اس نے کہا: "سینہ پر ہاتھ پڑ گیا ہوگا۔ دوسری کر دے۔" سلا دو۔

**بیوی**۔ "میں تو اب اس اکیلے کمرے میں نہ سونے دوں گی۔ اگر میری آنکھ نہ گھلتی تو کیا ہوتا وہاں لے جا کر سلاؤں گی یا آپ یہاں سوؤں گی۔"

**میاں**۔ "نہ تمہارے یہاں سونے کی ضرورت نہ اس کے وہاں جانے کی۔ بس تم جاؤ سوؤ۔"

**بیوی**۔ "اچھا بیٹی تو آیت الکرسی پڑھ لے۔ مگر ہاتھ آتی ہی کہاں ہے؟"

**میاں**۔ "ایسی ہی کرسی کی ضرورت ہے تو میں کرسی لا دوں۔ وہ رکھ دو۔"

**بیوی**۔ "توبہ توبہ تمہارے ایمان کو کیا ہو گیا۔"

ضمیر باہر جہاں گیا شاہدہ سو گئی۔ ساجد آکر بیٹی تو سب سے پہلے اس کو میاں کی اس کرسی کا خیال آیا کہ ان کے ایمان کو کیا ہو گیا۔ آیت الکرسی کا ایسا مضحکہ تو کیا کروں کس طرح اصلاح کروں کسی طرح خدا یاد نہیں آتا۔ اس کے بعد بیٹی کی گمراہی

کا جھکڑ بندھا کہ مسلمان کی بچی درود شریف اور کلمے سے واقف نہ ہو۔ اس کا عذاب تو مجھ پر پڑے گا۔ اور سب باتوں کو جانے دو نماز بھی تو نہیں آتی۔ ہائے کیا ہو گیا اور کیا کروں گی۔ ان خیالات میں اس قدر محو ہوئی کہ نیند صاف اڑ گئی ہر چند چاہا کہ کسی طرح سوؤں۔ مگر کسی کر دھچکین نہ پڑتا تھا۔ اٹھی چپکے سے کمرے میں گئی۔ اس کے سر ہانے کھڑی ہوئی آہستہ آہستہ آیت الکرسی پڑھی اور حصار باندھ کر چلی آئی۔

دونوں بہنوں کی جس طرح تربیت میں بعد المشرقین تھا اسی طرح خیالات میں بھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ چھوٹی نہ صرف بڑی کو جاہل۔ بچھو بڑے دونوں اور نا کارہ سمجھتی تھی۔ بلکہ اس سے بات کرنی بھی کچھ کسر نشان سی سمجھتی تھی۔ یہ تو کبھی ہوا ہی نہیں کہ زہدہ شاہدہ کے کمرے میں گئی ہو۔ یہ کسی دفعہ ہوا کہ کسی ضرورت سے یا محبت سے کوئی بات اس نے بہن سے کی اور وہ جھٹ سے اپنے کمرے میں گھس گئی۔ زہدہ کو ناگوار تو ہوتا۔ مگر اتنا کہ دل میں بل بھر کر بیٹھ جائے لیکن اس میں کام نہیں کہ اگر زاہدہ ایک دفعہ بھی ایسا کرتی اور بہن کی بات کا جواب نہ دیتی تو نشانہ ہلا وہ کٹر لڑکی اور کینہ ور بچی تھی کہ شاید عمر بھر بہن کی صورت نہ دیکھتی۔

ایک پیٹ کی دو بچیاں اور ایک باپ کی دو لڑکیاں۔ ایک گوشت ایک پوست مگر تربیت کے منفرد اثرات نے دونوں کے خیالات میں اتنا کچھ فرق کر دیا کہ ایک مشرق میں تھی تو ایک مغرب میں۔ زاہدہ مؤذن کی اذان کے ساتھ اٹھتی۔ باوجود ایک چھوڑ دو دو ماؤں کے اگر کسی کی آنکھ نہ کھلتی تو اپنے ہاتھ سے پانی گرم کر لیتی مگر می ہوتی تو خود ہی ٹھلیا بھر سبے پہلے نہاتی۔ اس کے بعد نماز پڑھتی اور کلام اللہ میں مصروف ہو جاتی۔ اس سے فارغ ہو کر خود کمرے میں جھاڑو پتی یا اپنے سامنے دلاتی اور پھر باورچی خانہ میں جا پہنچتی اور ماں کا ہاتھ بٹاتی۔ نسا صبح اٹھ بیٹھے سو کر اٹھتی اور بچھوٹوں میں لیٹے لیٹے چائے بسکٹ کھاتی۔ جب ناشتہ

ہو جاتا۔ تو اُنھ کو مُنہ ہاتھ دھوتی۔ کنگھی چوٹی کرتی اور مشن کی کتاب نئی شروع کر دیتی۔ دس بجے کے قریب مدرسہ چلی جاتی۔ بارہ بیسے کی بیماری اس کے پیچھے ایسی لگی کہ کوئی دن بغیر شکایت کے بسر نہ ہوتا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ محنت کرتی نہ مشقت۔ گھر کے کام کاج سے اسے کوئی واسطہ نہ تھا۔

شاہدہ کی بیماری سے ماں اور باپ دونوں پریشان رہتے تھے ساجدہ اچھی طرح سمجھتی تھی کہ جو افتادہ بڑ گئی وہ اچھی نہیں۔ بھلا کو اپنے کی عمر بے فکر زمانہ آزادی کے دن۔ اس وقت بیماری کیسی۔ اگر اب بھی بڑی کی طرح چلنے پھرنے لگے تو چار دن میں گھوٹا سی دوڑے مگر میاں کی وجہ سے ہوں نہ کر سکتی تھی۔

## پھٹا باب

اب تک تو ساجدہ کو شاہدہ کی تربیت کا رونا رہا۔ مگر اب خدا نے دو لڑکیوں کے ساتھ ایک بیٹے کی ماں بھی بنا دیا۔ لڑکے کی پیدائش سے ضمیر کو جس قدر خوشی ہوئی وہ بیان نہیں ہو سکتی۔ چھ دن اور رات دوستوں کے جلسے ہوئے۔ ناچ ہوا۔ گانا ہوا ڈنر ہوا۔ پارٹیاں ہوئیں۔ جس روز ساجدہ چھٹی نہائی ہے۔ اس روز بچہ کا عقیقہ تھا اور اس نے تمام رشتہ دار عورتوں کیساتھ ضمیر کی چچا زاد بہن اپنی منہ کو بھی بلایا تھا۔ یہاں جمع ہو گئے تو عقیقہ ہوا۔ اس کے بعد ساجدہ نے منہ سے کہا کہ آؤ بواٹھ دھلاؤ۔ اور بچہ کو اپنا کرتہ لٹپٹی پہنا کر منہ میں دو دھرو۔ شاہدہ پاس کھڑی تھی۔ ماں کا یہ فقرہ سُنکر مسکرائی اور جب پھوپھی نے اپنا کرتہ لٹپٹی پہنا کر یہ رسم ادا کی تو ٹھٹھے مار کر منسنے لگی۔ ساجدہ کو ناگوار تو بہت ہوا۔ مگر اس وقت سب کے سامنے کچھ نہ بولی۔ جب عقیقہ ختم ہوا۔ اور لوگ چلے گئے۔ ضمیر اندر آیا تو ماں کے سامنے ہی شاہدہ نے بیٹا کہا۔

”بابا آپ نے دودھ دھلائی کی رسم نہ دیکھی۔ نہایت پر لطف تھی۔ اما جان کا دودھ دودھ سے دھویا گیا اور چھو بھی جان کو اس کے بدلے روپے دے گئے وہ چپکے سے لیکر چلتی ہوئیں۔ کرتہ ٹوپی زیادہ سے زیادہ پانچ چھ روپے کا ہوگا۔ مگر جو کچھ ان کو ملا وہ اس سے بہت زیادہ تھا۔ یہ بھی بہت اچھی تجارت ہے۔ وہ کہتی ہوں گی کہ روز بیٹے ہوا کریں۔“

**ضمیمہ**۔ ”بیگم تمہاری تہہ حرکت میں مصلحت ہوتی ہے۔ ہمیں بھی تہہ بتاؤ آخر اس تجارت میں کیا منفعت تھی؟“

ساجدہ میاں کے سوال کا کچھ جواب دینے نہ پائی تھی کہ شاہد نے کہا ”اُس کی منفعت میں آپ کو بتا دوں۔ دودھوں نہائے پوتوں پھلے۔“

**ضمیمہ**۔ (ہنس کر) ہاں بیٹی ہاں۔ دودھ سے تو اسی لئے دودھ دھویا ہوگا۔ مگر پوتوں پھلے کیوں ہوا۔“

**شاہد**۔ ”وہ اسکے آگے محذوف ہے۔ دودھ ہی سے پوت بھی ہو جاتا ہے واہ بی اما جان۔ زمانہ اتنی ترقی کر گیا مگر شتاباش ہے کہ آپ کے کان پر جوں نہیں چلتی۔ یہ رسوم جنہوں نے ہمارا خاتمہ کر دیا۔ افسوس اب تک ہمارا چچا نہیں چھوڑتیں۔ جو روپیہ آپ نے ان کو دیا اگر وہ کسی قومی کام میں صرف ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔“

ساجدہ کا چہرہ غصہ کے مارے سُرخ تھا۔ ایک رنگ آ رہا تھا۔ اور ایک جا رہا تھا۔ مگر بالکل خاموش تھی۔ ضمیمہ بیوی کا یہ حال دیکھ کر اور بھی چپڑنے لگا۔ اور پھر کہا ”ہاں بیگم مصلحت نہ بتائی؟“

**ساجدہ**۔ ”میں خاموش ہوں۔ اور اس گستاخ کے منہ لگنا نہیں چاہتی۔ تم اپنے ساتھ اس کو بھی شہ دے کر شیر کرتے ہو!“

**شایدہ:** "نہیں اما جان یہ بات نہیں ہے۔ میں آپ سے دریافت کرنا چاہتی ہوں کہ اس میں کیا مصلحت ہے۔ میرے کان میں آواز پڑی رہی تو اچھی بات ہے۔"

**ساجدہ:** "تمہارا اعتراض لغو۔ تمہارا مسخکہ غلط۔ تمہاری رائے جھوٹی تمہاری عقل غلط۔ تم جس پر سنس رہی ہو یہ انسانیت کا وہ جوہر ہے جس کی تہ میں چھپتے ہوئے موتی دمک رہے ہیں۔ تم نے دو چار زبانوں سے رسوم کی تباہت سُن لی اور رٹ لی لیکن اصلیت کو نہ سمجھے۔ کاش خدا تم کو عقل دینا تو اعتراض سے پیشتر اور ہنسنے سے پہلے سوچتے اور سمجھتے کہ کیا کیا اور کیوں کیا۔ سنو اور سوچو۔ سمجھو اور غور کرو۔ آج چھ روز سے سینکڑوں روپیہ لہجبات اور خرافات میں ضائع ہو رہا ہے۔ لیکن ایک پیسہ ایک کوڑی۔ ایک وقت کا کھانا کسی ایسے شخص کو نہ دیا گیا جو مستحق تھا۔ تمہارے یا تمہارے باپ کے دل میں سینکڑوں اراں ہزاروں خوشیاں لاکھوں اُمگیاں پیدا ہوئیں۔ لیکن کبھی اس زبردست ہستی کی طاقت کا اندیشہ نہ پیدا ہوا جو آنا نانا کھلے ہوئے پھول ہنکتے ہوئے پودے اور چمکتے ہوئے نئے اجڑا سکتی ہے۔ جو کچھ ہم کو میسر ہوا اسی خدا کے برحق کی عنایت اور رحمت سے ہمارا فرض تھا اور جب تک زندہ ہیں رہے گا۔ کہ ہر وقت ہر ساعت ہر لمحہ اپنی گردنیں اس کے حضور میں جھکائیں اور اس نعمت سے جو ہم کو دیتا ہے اور دے رہا ہے اس کو بھی دیں تاکہ ہمارے کاموں میں ترقی ہماری مسرتوں میں اضافہ اور ہماری راحتوں میں برکت ہو۔ ہماری زندگیاں خالی خالی نہیں۔ ہر طرف سے فرائض اور حقوق میں لپٹی ہوئی ہیں۔ ہمارا کام کھانا۔ سینا ہنسا اور بولنا ہی نہیں فرائض کی ادائیگی اور حقوق کی نگہداشت بھی ہے۔ ہم پر بہت سے حقوق ہیں۔ عزیزوں کے پڑوسیوں کے۔ نوکروں چاکروں کے۔ غریب غریبوں کے۔ اور اُن کے جو عزت میں شرافت میں ہم سے کم نہیں مگر دولت اور ثروت میں ہمارے محتاج اور دست نگر ہیں۔ کیا یہ صحیح ہے

کہ ہمارے دسترخوان پر قورمے اور بریانی ہوں لیکن ہمارے عزیز فاقوں سے بھوکے سو رہے ہیں؟ کیا یہ درست ہے کہ ہمارے جسم پر دیبا و حریر ہوں اور ہمارے پیارے پیوند لگائیں اور ننگے پھر رہیں؟

تم کو رسموں پر اعتراض ہے۔ تم کس منہ سے بڑا کہتی ہو تم تو اس سے بھی بدتر کام کر رہی ہو۔ رسوم کی قباحات اس اعتبار سے درست کہ روپیہ برباد نہ ہو۔ مگر تم نے تو رات دن گچھرے اڑائے۔ کون سے طائفے تھے جو اس تقریب میں نہ آئے۔ کیا اس میں سے کچھ روپیہ خدا کی راہ پر نہ اٹھ سکتا تھا؟

رسوم بیشک قابل اصلاح ہیں۔ مگر ان کنکروں میں جو اہر بزرے ان گدڑیوں میں لال اور اس سیاہی میں سفیدی بھی ہو۔ تم کو معلوم ہے ہماری کتنا مقدس ہم کو کیا حکم دیتی ہے ذی نجی القربیٰ سے پہلے ہم پر ہمارے عزیزوں کے حقوق ہیں۔ اور ہماری حالت یقیناً خدا کا لاکھ لاکھ شکر کہ اس قابل ہو کہ ہم اپنے عزیزوں کے ساتھ سلوک کریں۔ اور ان کی ضرورتوں پر کام آئیں۔ میں نے کئی دفعہ تم کو اس طرف متوجہ کیا۔ مگر تم نے پروا نہ کی۔ میرا ایمان مجھے کہ جس طرح نجاست کا ایک قطرہ پانی کے بہرے ہوئے گھرے کو تپاک کر دیتا ہے اسی طرح عطر کی ایک بوند غلیظ کمرے کو بھی مہکا دیتی ہے۔ اس تمام روپیہ میں جو صرف ہوا اگر خدا قبول کر لے تو وہی ایک رقم جو میں نے تمہاری پھوپھی کو دی، اس قابل ہے کہ تمام اساتذہ کو پاک کر دے۔

یہ رسم جس کا تم نے مضحکہ اڑایا۔ سننے کے قابل نہیں۔ وہ کس شوق اور محبت سے کرتے تو پنی لائیں میرے اس سے بہت زیادہ قیمتی کپڑے موجود ہیں لیکن میرا کام یہ تھا کہ ان کا دل نہ توڑتی۔ اسی لئے میں نے بچہ کو اپنے کپڑے نہ پہنائے اور ان کا دل بڑھا دیا۔



کیا تم کو اس سے انکار ہے کہ دودھ کی مالش سے زچہ کا دودھ بڑھتا ہے۔ طب  
کی کتابیں دیکھو۔ اپنی لیڈی ڈاکٹر سے پوچھو۔ میں پڑھ بھی چکی ہوں اور پوچھ بھی اس  
فعل کو جو طب کے اعتبار سے نہایت مفید ہے۔ اگر اس صورت میں ڈھال دیا تو  
کیا خرابی کی۔ تم کو معلوم ہو یا نہ ہو۔ مگر مجھے خبر ہے کہ سلیمہ جس کے نیک پر تم کو  
اعتراف ہے نہایت بد نصیب عورت ہے۔ بیوہ ہے دو بچے ہیں اور ایک بڑھیا  
ماں اس کا حق یقیناً تمہاری کمائی میں ہے اور میں نے جو کچھ اس کو دیا ہرگز ہرگز  
اس پر احسان نہیں بلکہ تم پر ہے کہ میں نے مواخذہ عاقبت سے بچوایا۔“

## ساتواں باب

کہنے کو اور کہنے کو کیا حقیقتاً دونوں بچوں کے نکاح کا مختار باپ تھا اور گو  
وہ ایک کا عاشق زار اور ایک سے قطعاً بیزار مشرّع ہی سے تھا پھر بھی امید یہ تھی اور  
ایک دو کو نہیں سب کو کہ شادی کے معاملہ میں وہ جو کچھ کر بیگا دیکھ بھال کر اور سمجھ بوجھ کر۔  
لاکھ ناخوش اور علیحدہ رہی۔ مگر اپنی اولاد تھی۔ اور بد نصیب باپ کے گھر میں چند روز کی جہاں  
مناسب تھا دستور دنیا کے موافق اور حکم خدا کے موافق کہ بکثرت زیادہ نہیں اتنا اور  
بہت نہیں اس قدر سمجھ لیتا کہ کوار پتہ ہمیشہ رہنے والا اور زاہق سدا ٹھہرنے والی  
نہیں یہ سادوں کی چڑبا۔ برسات کا چھینٹا۔ صبح کی چاندنی اور ریت کی چمک ہے۔ وقت  
آ رہا ہے کہ یہ اس گھر کو ترسیگی۔ اور میں نہیں تو میرے گھر کا کوئی نہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر  
اس کی صورت کو دیکھے گا۔ اور نظر نہ آئے گی۔ میں کہاں اور یہ کہاں۔ یہ بھی وقت کی  
بات اور محض اتفاق ہے کہ میرے غصے کی نظریں اور تیوری کے بل دیکھ رہی ہے۔  
اور سہہ رہی ہے۔ مگر سمجھتا تو اس وقت جب دماغ صحیح اور عقل درست ہوتی۔ خبر  
اس کا بھی مضائقہ نہیں اس دنیا اور اس جہان میں عقل مند بھی جیتے ہیں۔ بیوقوف بھی

مہشیار بھی رہتے ہیں۔ مریں بھی۔ مگر یکجہت تو بیوقوف اور بہبودہ ہو کر ہمیشہ اور ہر حال میں اپنے تئیں عقلمند اور لائق سمجھتا تھا اس کو شاہدہ کی محبت تھی۔ اور محمد علی نہیں بہت زیادہ۔ مگر اس میں بھی صداقت نہ تھی وہ صرف اس توقع پر اس کا فریفتہ تھا کہ یہ میری مرضی کے موافق اور خواہش کے بموجب تہذیب کا مخزن اور شہرت کا معدن ہوگی۔ بہر حال کیفیت یہ تھی کہ ایک آنکھ میں ہر بہر ایک آنکھ میں خدا کا قہر۔ شاہدہ علی الاعلان کھلے خزانے جو چاہتی وہ کرتی۔ جو جی میں آتا ہستی مگر اُٹ نہ کرتا۔ جب رئیس البیت بھی بھلی اور بُری سب دیکھتا اور جائز سمجھتا تو ناجائز سمجھنے کا حق کس کو اور نوکنے والا کون شاہدہ جو کچھ بھی کرتی کم تھا پردے کی پروا سے نہ تھی بزرگوں کا ادب اسے نہ تھا۔ اور پھر لطف یہ کہ ماسے لے کر بہن تک اور بڑے سے بیکر چھوٹے تک سارے گھر کو جاہل اور دنیا نوسی سمجھتی تعلیم۔ تربیت۔ محبت کچھ تین چیزیں تھیں جنہوں نے اس کو مغربی سائے میں ڈھالا ان پر طرہ باپ کی داد تھی۔ کہ ہر قول کو اور ہر فعل کو سر پر رکھتا اور ٹھکوں سے لگانا وہ ماں کے منہ درمنہ اور بہن کے سامنے ڈنکے کی چوٹ دونوں کو جاہل باقی اور بیوقوف کہتی۔ ماغریب کے فرشتوں نے بھی اس ڈھنگ کی لڑکی دیکھی نہ سنی۔ جلتی ٹھلستی انگاروں پر لوثی اور آگ میں جھنپی۔ مگر جانتی تھی کہ سمجھنا بچھانا تو درکنار ادھی پاتا بھی زبان سے نکالوں گی تو پیچھا چھڑانا شکل ہو جائے گا۔ ایک کہوں نہ چار سنوں ہم اس معاملہ میں قطعاً ساجد کا کہہ کر عیب سے پاک اور ہر نقص سے دور رہ سکتے ہیں۔ آخر شاہدہ بھی تو اسی کی بچی تھی۔ اُسی گود سے اُٹھی اُسی دودھ سے پی کر دوڑوں میں زمین آسمان کا فرق اور مشرق و مغرب کا بُعد تھا۔ تمام ذمہ داری از ابتداء تا انتہا اسی بد نصیب باپ پر ہے جس نے غیروں کی طرح آنکھوں چٹکیوں رکھ ایسا کانوں میں تیل ڈالا کہ رتی بھر پردہ نہ کی۔ جوان قریب قریب نول ہی ہو چکی

نہیں۔ اب دونوں کا کواریپتہ ماں کے واسطے پوری مصیبت تھی۔ وہ لاکھ شاہدوں سے بے تعلق تھی۔ مگر ماتنا کا کیا علاج کرتی۔ کہ صرف اس خیال نے کہ عمر میں دھل رہی ہیں اور بڑ نہیں جڑتے اس کو کھانا پینا سب حرام کر دیا۔ رات اسی چکر میں ختم اور دن اسی اوجیڑ میں پورا ہو جاتا۔ دو چار دفعہ میاں کو بھی متوجہ کیا مگر وہ بجائے اس کے کہ بیوی کے بیچ میں شریک ہو کر یا کوئی اور معقول بات کہہ کر اس کو تسکین دیتا۔ جب بولا اُٹا اور جو جواب دیا اونڈھا۔ اور آخری فیصلہ یہ کیا۔ کہ تم شاہدوں سے بے فکر رہو۔ اپنی بچی کا انتظام کرو اس کا بھی ہو جائیگا۔ خدا کا شکر ہے روپیہ کی کمی نہ تھی۔ عزت بھی تھی اثر بھی تھا۔ ایک خرابی بی مخلصی کی تھی۔ تو روپیہ کے آگے ہڈی کو کون پوچھتا ہے۔ دولت نے اچھی طرح چھپا دیا۔ بات نہ کہنے یا شادی نہ ہونے کی وجہ اور تھی اور معقول تھی۔ بی شاہدوں کے گن چھپے ڈھکے اور میاں کے کرتوت ایسے ویسے نہ تھے۔ ایک دنیا میں شہرت اور ایک جہان میں ڈبکا بچکا تھا۔ بچارے اگلے زمانہ کے سیرھے سارے تو اس کا نام آتے ہی کانوں پر ہاتھ دھرتے تھے کہ زبان نے اچھی طرح بتا اور وقت نے پوری طرح سمجھا دیا تھا کہ یہ نقشہ جدید کی منوالیاں تقلید غیر میں اتنی شرابور اور ایسی چکنا چور ہیں کہ میاں کو لنگوٹی بندھوا بھی نہ چھوڑیں گی۔ یہ بارہ مہینے کی روگی۔ تیس دن کی بیمار۔ کام کی پہنیں۔ کاج کی یہ نہیں۔ رہے اس رنگ کے شیراؤں کی خواہشیں بڑھی ہوئی۔ تمنا میں پھیلی ہوئی۔ حسن کے متلاشی، دولت کے جو یا تعلیم کے خواہاں، سلیقہ کے آرزو مند ان کو کیا غرض پڑی تھی کہ جب تک پورا مقابلہ نہ کر لیں اور دس پانچ کو ذلیل، دو چار کو حقیر ایک آدمہ کو جاہل نہ بنادیں شادی پر آمادہ ہو جائیں۔ بی شاہدوں کا نام شہر میں پوری طرح روشن اور اچھی طرح اچھل چکا تھا۔ اور ابھی تک ایسے بڑھے ٹھڈھے موجود تھے جو مٹی سی بات پر رقتہ واپس کر دیں کہ بھائی ہم کوٹ پتوں کی عزت کے قابل نہیں

اب ان کی کھپت ہو سکتی تھی تو اپنے ہی رنگ میں۔ اب چاہے تو یہ سمجھو کہ ایک  
 مچھلی نے سارا جل گندہ کیا چاہے یہ کہ چنے کے ساتھ گھن بھی پسٹا، شاہد کے ساتھ  
 زاہد کی پر بھی مصیبت آئی کہ اس کا پیغام بھی اڑ گیا۔ سیاں کا جواب سن اور زام کی  
 کیفیت دیکھ چاہتے تھے کہ ماں خاموش ہو جاتی یا ان فکروں سے چھٹکارا پاتی  
 جوں جوں دن بڑھتا جا رہا ہے۔ اس کا سہم ترقی کر رہا تھا۔ حصن حصین کا ختم  
 یا سمیچ کا چلہ دونوں پورے کر لئے۔ مگر بات بڑی کی آئی نہ چھوٹی کی۔ یہ نصیب  
 کو ایک آدمہ دفعہ نہیں دوچار دفعہ اور فقط اپنوں ہی سے نہیں غیروں تک سوسہ چھوڑ کر  
 کہت پڑا کہ بچیوں کا خیال رکھنا۔ مگر شاہد کچھ ایسی بدنام ہو چکی تھی کہ کوئی حامی ہی نہ بھرتا  
 تھا۔ اتفاق یہ ہوا کہ رحیم شاہد کی داروغہ، حساب کتاب کی فضا رسالہ گرم کرنے  
 آگ کی بھری انگلی سے آ رہی تھی۔ گرمی کا موسم تھا۔ چوکھٹ پر چڑھتی تھی کہ پاؤں پٹا  
 اور دھڑام سے گرمی۔ سفید چادر لال غالیچے، ریشمی پردے، سب بھرتے ہوئے۔ کہنیوں  
 تک دونوں ہاتھ منہ ٹھوری کھلے سب کی چربی نکل آئی۔ جب بڑھیا تو نہ تھی۔ مگر پیس  
 کا پٹا ضرور تھا۔ خاصی شریف خاندان کی عورت اور ایک اوسط درجہ کے شوہر کی  
 بیوی تھی۔ گرہے درہے موتیں اور تنویر مصیبتیں کچھ ایسی آکر پڑیں کہ پلنگ پر درستی  
 نہ رہی۔ ایک کرٹیل بیٹا مرا۔ ایک جوان مٹی گئی۔ سارندہ تھی وہ بھونس۔ بھائی موجود  
 وہ دیوانہ چار ساڑھے چار برس سے یہاں کام کر رہی تھی۔ کل کا دن یا سکھ کی رات تو  
 ایک گزرا نہ گزری ہر وقت کل کل اور پٹ پٹ تھی۔ اُو گدھی بات بات میں چور بے ایمان۔  
 مگر پیٹ بڑی بلا ہے۔ اُٹھاتی جو پڑتی اور بھگتی جو آتی۔ شاہد کے دربار میں تنابڑ  
 واقعہ اتنا سنگین جرم اتنا عظیم تصور مصیبت تھی آفت تھی۔ قیامت تھی۔ بڑھیا جو ایک آدمہ  
 دفعہ پٹ بھی چکی تھی آج موت کا یقین کر بیٹھی۔ آگ تو خیر دوسری مادوں سے آکر بجھائی مگر  
 شاہد کو صبر کہاں۔ ٹٹھی جو منہ میں آیا کہا اور سنایا۔ مگر یہ کافی نہ تھا۔ ایک لات ایسی ہی

کہ انگلیٹھی پر جا کر گری اور ٹھیلے ہوئے چہرے سے خون نکلنے لگا۔ اس وقت تو بات گئی گذری ہوئی۔ مگر رات کو اپنے گھر پہنچی تو دلنا دو پھر تھا۔ یہی شاہد کو جب تک یہ معلوم ہوا تھا کہ کھانا دیوانے بھائی کو کھلاتی ہے۔ تو یہ اہتمام کیا تھا کہ یہیں سے کھاپی خالی ہاتھ جائے۔ یہاں سے جا کر دیوانے بھائی کا کھانا پکاتی۔ آج گئی تو بدن چور تھا۔ اور آگ میں جل رہی تھی۔ مگر اسی حال میں گرتی پڑتی اٹھی اما گوشت رواں پکائی کھلا چکی تو بیٹی مگر نیند کہاں ساری رات یہ معلوم ہوا کہ انگاروں پر لوٹ رہی ہے صبح حکیم کے ہاں گئی نسخہ لکھوایا۔ پیسہ پاس نہ تھا۔ تین مہینے کی تنخواہ شاہد پر چڑھی ہوئی تھی۔ سوچا کہ تنخواہ لے آؤں اور علاج شروع کر دوں۔

..... یہاں آئی تو میٹھا بھی شکل تھا۔ بڑی شکل سے ڈول میں بیٹھ جائے کرتی آئی۔ کچھ کہنے بھی نہ پائی تھی کہ شاہد ۵ صورت دیکھتے ہی آگ بگولا ہو گئی اور چہرے سے نیچے اتر کر کہنے لگی۔  
 ”یہ فیلسوفی کس بات کی ہے تو کس کے حکم سے آج غیر حاضر ہوئی؟“  
 ”جیسا“ آپ میری حالت دیکھتے ہیں کیا کام کے قابل ہوں۔“  
 ”شاہدہ۔“ حالت میں کیا ہے۔ اگر کام کے قابل تو نہیں ہے۔ تو اپنا عیوض دیا ہوتا۔“

”جیسا۔“ میں بیگم کس کو لاؤں؟  
 ”شاہدہ۔“ آہستہ بات کر۔ گسٹنخ بدتمیز۔“  
 ”جیسا۔“ میری تنخواہ دیدیکھتے تو دو دوائی ٹھنڈائی کر دوں۔“  
 ”شاہدہ۔“ تنخواہ ضرور ضرور دیا رکھو۔ ہرگز تنخواہ نہیں مل سکتی۔ کام کر دو اس کے بعد تنخواہ مانگو۔“

”جیسا۔“ بیگم میں تو مر رہی ہوں کام کیا خاک کر دوں گی۔“

**شاہدہ** - ”پھر گستاخی کا بات - اُو کا موافق بات مت کرو۔ نکل جاؤ۔“  
**رحیمہ** - ”بگم میری ننخواہ دسے دو میں چلی جاؤں۔“  
**شاہدہ** - ”بگم مت پہلے عوض حاضر کرو۔ اس کے بعد ننخواہ کا درخواست کرو۔ جتنا نقصان ہوا وہ سب کاٹ جائے گا۔“

**رحیمہ** - ”آپ ایک کوڑی نہ دیکھے۔ میں عوض کہاں سے لاؤں۔“  
**شاہدہ** - ”تمہارا بھتیجی موجود ہے۔ اس کو بھیج دو کام کرے گا۔ تم ہرگز نہیں جانے کا جب تک وہ نہ آئے۔“

**رحیمہ** - ”بیوی میں تو بڑھیا تھی۔ برقع سر پر ڈال دیا۔ سیانی تھی کو کیسے باہر نکال دوں مجھ پر تو پڑی تھی نوکری کر لی۔ اس کو کیا غرض جو وہ نکلے۔“  
**شاہدہ** - ”وہ نہیں نکلے ایکوں نہیں؟“

**رحیمہ** - ”بیوی عزت بھی آخر کوئی چیز ہے یا نہیں۔ آخر ہمیں تو اسے بچنا ہے۔ کیسے باہر نکال دیں۔“

**شاہدہ** - ”تم عزت دار ہے۔ اُو اچھا تم کو عزت دے گا۔ تم مت لاؤ اسکو،  
**رحیمہ** - ”بیوی ذرا تو زبان سنبھال کر بولو۔ میری جان نکل رہی ہے آپ  
 ننخواہ دیتی ہیں دیں نہیں تو میں چلی جاتی ہوں۔“

**شاہدہ** - ”چپ رہو اُو تم نہیں جاسکتا۔ ہم ابھی تمہارا علاج کرتا ہے۔“  
**رحیمہ** بد نصیب کو ننخواہ کا ملنا تو درکنار خالی جانا بھی امرت ہو گیا۔ ارادہ کیا تو شاہدہ نے زبردستی پکڑ کر بٹھالیا اور حکم دیا کہ بلا اجازت یہاں سے سرکی تو سمٹ سزا دیگی۔ ادھر اس کو بٹھایا اور ہر آدمی کو بچھ بھتیجی کو بلا بھیجا کہ رحیمہ بدار ہے ہے۔ منیرا آئی تو اس کی صورت دیکھتے ہی رحیمہ بیتاب ہو گئی اور کہنے لگی ”کیوں آئی۔“  
**منیرا** - ”تم ہی نے تو بلایا ہے۔ آدمی کیا تھا۔“

رحیمؔ بڑی بیگم آپ ہی لاشہ فیصلہ کیجئے۔ بھلا کسی کی کواری بچی کو اس طرح بلا لینا اچھی بات ہے۔ ہم غریب سی۔ فقیر سی۔ مگر اپنی عزت تو رکھتے ہیں۔ ہاتھ بچا ہے ذات تھوڑی سی ہے۔ دیکھئے تو سی۔ منیرؔ کو بلالیا!

شاہدہؔ ”گدھے کی بچی عزت دار کی جو رو چپ رہو۔ ہم خواہ دیں گے مفت کام نہیں لیں گے۔ تنہا فرض ہے کہ تم مرتا ہے تو اپنا عیوض دو۔ تنہا ہی موت ہم کو تکلیف نہیں دے سکتی۔“

یہاں تک بھی مضائقہ نہ تھا۔ اس کے بعد شاہدہؔ کا غصہ اور تیز ہوا اس نے فوراً رحیمؔ کو گھر سے نکل جانے کا حکم دیا۔ بجار میں ہل ہلا رہی تھی۔ چوٹیں مڑ رہی تھی۔ مگر اپنی بیماری اور موت دونوں بھول گئی۔ چلتے لگی تو بھتیجی کا ہاتھ پکڑا مگر پیچھے سے ایک اس زور کا دوشتر پڑا کہ آنکھیں کھل گئیں۔

”گدھے کی بچی یہ نہیں جاسکتی جب تک دوسرے آدمی کا انتظام نہ ہو جائے۔“

رحیمؔ ”بیگم ذرا انصاف نہ تو کیجئے میں کس طرح سبانی بچی کو آنکھ سے اوجھل کر دوں۔“

شاہدہؔ ”نہیں نکل جاؤ۔ ابھی فکلو۔ ہم دوسرے آدمی کا انتظام کرتے ہیں جس وقت آگیا اسی وقت اس کو نکال باہر کریں گے۔ چار باہر جاؤ فکلو فکلو ابھی چلو چلو فوراً غارت ہو بڑھو آگے بڑھو۔“

رحیمؔ روتی ہوئی باہر نکلی۔ اس خیال سے کہ شاہدہؔ کو کچھ تصفیہ کرے۔ اس کے پاس مروانے ہیں پہونچی۔ مگر وہ بچلے مانس بھی تو شاہدہؔ کا باپ تھا۔ ساری کتھا سن چکا تو کہنے لگا ”مس صاحبہ کے انتظام میں ہم کو دخل کی ضرورت نہیں۔“

مایوس ہو کر پھر گھر میں آئی تو شاہدہؔ نے دوسری عورت کو بلا کر کہا یا خنا منیرؔ کو اپنے ساتھ لے جاؤ اور جب تک ہم حکم دیں اپنے پاس کھو حکم کی تعمیل میں کیا کر

ہو سکتی تھی۔ منبرِ حمید کے ساتھ روتی ہوئی جا چکی تھی۔ چاروں طرف دیکھا ہر ایک سے پوچھا۔ کتنی سنتی پھری روتی گڑ گڑاتی پھری مگر کس کی مجال تھی کہ شاہد کے معاملہ میں دم مایہ نہ ہو سکے۔ یہ گرمی کا پہاڑ سادہ کیسی دوائی اور کس کی ٹھنڈائی پانی کے دو گھونٹ بھی نصیب نہ ہوئے۔ زلزلہ اور ماں دونوں شاہد کا ظلم دیکھ بھی رہے تھے اور رحیمؑ کی بے گناہی پر کلیجہ بھی کٹ رہا تھا۔ مگر اتنی ہمت نہ تھی کہ شاہد سے تو کیا رحیمؑ سے بھی بات کر لیتے۔ شام کے وقت زلزلہ اور ماں عصر کی ساز سے فارغ ہوئے تو شاہدؑ تھا تو شاہدؑ تھا دھوکہ کلب کے واسطے کپڑے بدل باہر آئی۔ ہاتھ میں ٹینس کا بالہ تھا۔ رحیمؑ کو حکم دیکر کہا:-

”تم مگر لوگ اتنا نہیں خیال کرتے کہ کسی کو تکلیف دینے کا علم کو حق کیا ہے تم بیمار ہے تو اچھا بات ہے اتنے روزہ منبرؑ کو کام کرنا چاہیے۔ اگر اس سے پہلے ہم کو آدمی مل گیا تو ہم اس کو چھوڑ دے گا۔“

رحیمؑ:- ”بھلا یہودی ذرا انصاف سے بات کرو جو ان بچی کیسے ایسے چھوڑ دوں خدا کے واسطے بتاؤ تو سہی وہ ہے کہاں؟“

شاہدؑ چلی گئی تو رحیمؑ نے حسرت سے اس کی ماں کی طرف دیکھا جب وہ بھی خاموش رہی تو باہر آئی۔ مغرب کی اذان ہو رہی تھی کہ شاہدؑ واپس آئی اور حکم دیا ”اس بڑھیا کو ابھی نکال دو۔“

نکلی، چلی، گھر پہنچی بخار تیز تھا۔ جسم بھنا جا رہا تھا لیٹی مگر نہ لیٹا گیا۔ اٹھی کھڑی ہوئی کلیجہ میں پھر ہوک اٹھی اور اسی طرح تڑپتی تڑپاتی آئی۔ شاہدؑ آرام کرسی پر لیٹی تھی کہ رحیمؑ نے گڑ گڑا کر کہا:-

”بیگم خدا کے واسطے غصہ کو تھوک دو اور مجھ پر رحم کرو میں نے اتنے دن آپ کی خدمت کی ہے آخر کچھ تو میرا بھی حق ہے مجھ پر اگر کوئی مصیبت آتی تو آپ ہی کے



پاس پہنچتی۔ آپ خیال تو کیجئے کہ آخر جو ان بیٹی کو کوئی بھی آنکھ سے ادھیل کرتا ہے، بیگم کواری لڑکیوں کی ابرو تو موتی کی سی آب ہے۔ آپ دیکھ رہی ہیں کہ کیا وقت جا رہا ہے۔ دوپہر سے بچی مجھ سے چھوٹی ہوئی ہے۔ میں تو بیگم اپنا بھار بھی بھول گئی۔ اللہ اپنے اما باؤ کا صدقہ، بہن بھائیوں کا صدقہ، مجھ پر رحم کیجئے اور بتا دیجئے کہ میری بچی کہاں ہے۔ اگر کہیں اور بھیج دیا ہے تو میں گرتی پڑتی وہیں پہنچوں گی اور اس کو لاؤں گی۔“

**شاہدہ۔** ”میں اما کی طرح سیدھی اور زلف کی طرح بیوقوف نہیں ہوں کہ اس غلطی میں آ جاؤں۔ میں نے جو بات تھی وہ کہہ دی۔“  
**رحیمہ۔** ”بس تو میری میں تھانہ میں جاتی ہوں۔“  
 اتنا سنتے ہی شاہدہ آپ سے باہر ہو گئی۔ بلا اٹھاتا تو ایسے واسے کہ بڑھیا ہلک گئی۔ اور روتی ہوئی بھاگی۔

شاہدہ نے اتنی ہوشیاری اور کی تھی کہ چلتے وقت منیرا کے ہاتھ میں ایک سونے کا چھلا ڈال دیا تھا۔ بچی تیرہ برس کی جان کبھی بھولے سے بھی رات کو چھو بھی سے جڈانہ ہوئی۔ ذرا چراغ جل جاتے تھے تو غریب کو ایک ایک لمحہ ایک سال ہو جاتا تھا۔ اب جو اس دھوکے میں پڑ جھیل کے ہاں پہنچی تو اس کا لڑکا شرابی کبابی، جاری ڈھنڈاری، نشہ میں دھت، نالائق، مست، منیرا کو دیکھ لگا۔ ہلکی ہلکی باتیں کرنے۔ بچاری کو سنا نا آگیا، کچھ دیر تو چپکے بیٹھی رہی اور پھر سیدھی اٹھ دروازہ کھول، گھر سے باہر آ جہر منہ اٹھا ہوئی۔ رات کا وقت عورت ذات، بازار سے ناواقف، محلہ سے بے خبر، چاروں طرف ڈھونڈھتی پھری۔ خاک پتہ

نہ چلا۔ کہیں ادھی رات کے قریب پوچھتی پوچھتی گھر پہنچی تو چھو بھی بد نصیب دروازہ کھولے، یہوش پڑی تھی۔ آکر ہتھار کیا۔ بڑی شکل سے آنکھ کھلی تو گھر آکر

از علامہ راشد البخیریؒ  
 اُٹھتی۔ بھتیجی کو گلچند سے لگایا اور اتنا روتی کہ پھر غش آگیا۔ رحیمؒ کی حالت  
 لمحہ بہ لمحہ ردی ہو رہی تھی۔ بڑی شکل سے کہیں ڈیڑھ گھنٹہ میں ہوش آیا۔  
 تو پانی مانگا اور کہا :-

”خدا کے واسطے منیرؒ! میرے منہ اور ہاتھ میں لکڑیاں جل رہی ہیں  
 ان پر پانی ڈال دے۔ بلا سے ڈرانو ٹھنڈک پڑے۔“

منیرؒ نے پانی ڈالا تو ذرا جان میں جان آئی۔ صبح ہو چکی تھی۔ دیوانہ ایک  
 دن اور ایک رات کا بھوکا اُدل جلاں بک رہا تھا کہ دروازہ پر دوسپاہی  
 اور ایک وفودارؒ موجود ہوئے اور دروازہ اندر گھسے چلے آئے۔  
 ”منیرؒ! تیرا نام ہے یہ چھٹا تو خیر نکل آیا، بٹن کہاں ہیں؟“  
 منیرؒ ”چھٹا کیسا؟“

وفودارؒ ”چوری اور سر زوری! مال موجود چور موجود۔ اس کے باوجود  
 تو پوچھتی ہے بٹن کیسے؟ مس صاحب کے بٹن اور چھٹا تم دونوں لیکر جا گئیں  
 بٹن سیدھے ہاتھ سے ادھر دے۔“

منیرؒ ”اجی ہم تو چور نہیں ہیں۔ یہ ہمارے ہاتھ ہیں مس صاحب! سچے  
 تیردستی پہنا دیا تھا۔“

وفودارؒ ”ہاں ٹھیک ہے۔ چل ہمارے ساتھ آ۔ تو بھی کھڑی ہو  
 ری۔ ادھر چل۔“

آگے آگے بیمار اور پیچھے پیچھے مردہ رحیمؒ! اس کے ساتھ معصوم اور  
 سیدھی سادھی مٹیالا ان کے پیچھے سپاہی اور وفودارؒ سب مل مار کر قتلے پہنچے  
 تھوڑی سی کھا پڑھی ہو ہوا دونوں پھوپھی بھتیجیاں حوالات کر دی گئیں۔  
 اس واقعہ کی تیسری رات تھی۔ دو بج رہے تھے۔ احاطہ حوالات کے

ہرست خموشی چھائی ہوئی تھی۔ پیپل کے سبز پتے اور گلہابی مائل کوہلیں ان دونوں بیگناہوں پر حسرت کے آنسو گرا رہی تھیں۔ وقتاً درجہا کی طبیعت زیادہ بگڑی اُس نے منیرا کو اپنے پاس بلا کر کلیجے سے لگایا اور کہا:-

”میرا اب آخر وقت ہے۔ زندگی کی اُمید نہیں میرے بعد خدا کے سوا تیرا کوئی وارث نہیں۔ مقدمہ کا نتیجہ جو کچھ ہوگا۔ تقدیر کا لکھا ہے مٹنے والا نہیں۔ خدا اس صاحب کا بھلا کرے۔ آہ میری محنت کا بدلہ میری خدمت کا سلوک یہ ہی تھا۔ خیر خدا اُن کو خوش رکھے۔ میں نے ان کا نمک کھایا ہے۔ بددعا نہ دوں گی۔ اب میری آواز نہیں نکلتی۔ پیاس کے مارے حلق میں کانٹے پڑ رہے ہیں تھوڑا سا پانی اگر مل جائے تو پڑکا دے۔“

پھوپھی کی گفتگو سُننے ہی منیرا بیتاب ہو گئی۔ اس کے قدموں میں گر پڑی اور کہنے لگی:-

”اس حالات میں۔ میں بے گناہ گرفتار ہوں۔ پھوپھی جان خدا کا واسطہ یہاں میرا ساتھ نہ چھوڑو۔ میں نہ معلوم کیسی تقدیر سے کرا آئی تھی۔ کہ میری وجہ سے آپ پر بھی مصیبت آگئی۔ پانی کہاں سے لاؤں؟ گھر ڈھکی پڑا ہے۔“

رحیمہ:- ”ہائے بچی بدن بھلا جا رہا ہے خدا کا واسطہ پانی۔“

منیرا:- ”اے بھائی پھر سے والے تھوڑا سا پانی دیدو۔ میری پھوپھی کی حالت بہت خراب ہے۔“

پھر سے والا:- ”تجھ کو یہاں چھوڑ کر دو کوں پر پانی بھرے جاؤں کہ تو بھاگ جائے۔“

رات مریض پر تڑپتے تڑپتے اور ہکتے ہکتے صبح ہوئی۔ آٹھ بجے کے قریب کو تو ال صاحب آئے لمزموں کو دیکھا اور رحیمہ سے پوچھا تو اس نے کہا:-

”ہم دونوں بھوپتی بھتیجیاں چور ہیں۔ یا نہیں خدا ہی اس کا فیصلہ کرے گا۔  
 ہاں تقدیر میں جو رسوائی ہونی تھی وہ ہو گئی۔ یہ میری جوان بچی گھر چھوڑ قیدیں آگئی۔  
 ہم اپنے گھر میں رہتے تھے جو روکھی سوکھی خدا دیتا تھا کھاتے سنتے۔ یہ خبر نہ تھی کہ  
 قسمت یہ دن بھی دکھائے گی۔ اپنی تکلیف کا خیال نہیں۔ ہاں یہ سچ ہے کہ ہماری  
 آبرو برباد ہوئی۔ ہم برادری میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔ اب اس بچی کو کون  
 قیولے گا۔ جو ہم پر پڑی خدا دشمن پرندہ ڈالے۔ یہ بچی نہ لینے میں نہ دینے میں۔ اس وقت  
 بیگناہ گرفتار ہوتی ہے۔ ہمارا قصور صرف اتنا ہے کہ ہم غریب ہیں۔ مفلس ہیں  
 میں بیمار ہوں مر رہی ہوں ہم پر رحم کیجئے۔ خدا آپ پر رحم کرے گا۔“  
 رحیمؑ کی گفتگو سچی تھی۔ کو تو ال آدمی معقول تھا۔ بات سننے ہی نہ کو  
 پہنچ گیا اور اسی روز دونوں کو دبا کر وادیا۔

## آکھواں باب

زاہرہ۔ ”ہاں اما جان نانی صاحبہ کے کچھ اور حالات بیان کیجئے۔ مجھے  
 نذران کی باتوں میں بہت ہی لطف آتا ہے۔ ہم بد نصیب ہیں کہ ہم کو انکی نارت  
 تک نصیب نہ ہوئی۔“

مال۔ ”ارے بیٹی کیا سنناؤں وہ باتیں خواب خیال ہو گئیں وہ صورتیں  
 خاک میں چھپ گئیں۔ مرنے والوں کے خیال سے کیلچہ منہ کو آتا ہے۔ اب وہ صورتیں  
 کہاں؟ اب تو نئے نئے لوگ نئی نئی باتیں پیدا ہو رہی ہیں۔ وہ اگلی باتیں دیکھنے  
 میں آتی ہیں نہ سننے میں۔ جدھر دیکھو نئے دور اور جس طرف آنکھ اٹھاؤ انوکھے  
 رنگ۔ وہ بیٹیاں ہیں نہ بایں وہ گھر والیاں ہیں نہ بیویاں۔ میرے تو دیکھ دیکھ کے  
 اوسان اڑتے جاتے ہیں۔ دور کیوں جاؤں اور کو کیا کہوں۔ اپنا ہی گھر دیکھوں اپنی

پیٹ پر نظر ڈالوں۔ رحیمہا کے ساتھ جو ہوئی ہے۔ میرے لہو بدن کے روکنے کے  
کھڑے ہو گئے۔ خبر نہیں بیچاری پر کیا گزری۔ میں تو اس کی عورت کو ترس گئی  
بھلا وہ بچی محصوم اس نہ پاس غریب لپیٹ میں آگئی۔

زادہ۔ "ہاں اماں۔ یہ تو جگہ تھی ہو۔ میں بھی تھر تھر کانپ رہی تھی۔  
جیہ وہ روٹی آئی ہے اور گھر کیاں پڑی ہیں۔"

مال۔ "کوئی آج اسی گھر میں سنے نوکر اور مائیں تو آئے ہی نہیں۔ اللہ  
نے اپنی اپنی جینیت کے موافق سب ہی کو دے دیے ہیں۔ اماں جان کے ہاں بھی کہ  
بیچاری غریب آدمی ہیں ایک ٹوٹی بھوٹی اینٹک پڑی ہوئی ہے۔ مگر بڑی چھوٹی  
کے ہاں نقش بنی ایسی آئی کہ مگر ہی نکلی۔ جوانی اور بڑھاپا سب کے سامنے اسی دہلیز پر  
کاٹ دیا۔ ڈیرہ برس کی رانڈ ہوئی مگر اس آن کی عورت تھی کہ اس کا پتہ تک کسی  
دیکھتا نصیب نہ ہوا۔ نانی جان کے ہاں کا حال تو کیا سناؤں اللہ کا شکر ہے ان کے  
ہاں ایک چھوڑتین تین مائیں گھر میں اور دو نوکر اور ایک باورچی باہر تھے مگر وہ نوکر لڑکا  
اور ماماؤں پر کیا موقوفہ ہی۔ محلے اور پڑوس تک کو عزیزوں سے زیادہ سمجھتی تھیں آج  
کے زمانہ میں اگر وہ ہوتیں تو یا تو یہ دنیا ان کو بیوقوف سمجھتی یا وہ اس دنیا کو دیوانہ نام لگتی  
شاید تعجب ہو گا بھنگن سے بڑا اور بستی سے بھائی کر کے بات کرتی تھیں۔ ماما نے کسی

رشتہ کی عورت کا بچہ میکر پال لیا۔ اور وہ مرنیا۔ بچہ برس دو برس کا نہیں پانچ چار  
مہینہ کا نہیں فقط چھ دن کی جان۔ گرمی کا یہ حال کہ چیل انڈا چھوڑے دو دن ماما  
نہیں آئی۔ تیسرے دن آئی تو اس سے یہ تک نہ پوچھا کہ تیرے منہ میں کسے دانستہ۔  
اس پر غضب یہ کہ آپ چوٹے کے آگے بیٹھی روٹی ڈال رہی ہیں اور دم نکل رہا ہے  
اس نے اگر رونا شروع کیا تو آپ بھی روٹی چھوڑ چھاڑ اس کے ساتھ روتے بیٹھ گئیں۔  
رشتہ کا ایک خالہ وحید سی تھیں یہ تو خبر نہیں کہ کیا رشتہ تھا۔

اور کس کی بیٹی بیوی تھیں۔ مگر اتنا سنا تھا کہ ان کے ساتھ کی کھیلی ہوئی ہیں ہم  
 بیٹھے کنویں میں وہ چھوٹی بارہ دسی چار آٹہ ڈولی کا فاصلہ کبھی جانا بھی ہوتا تھا  
 تو چلتے چلتے آندھ آجاتی تھی۔ مگر ان خالہ وحیدی کی وندھاری یہ تھی کہ آندھ جاتے  
 میند جاتے مگر ان کا جہہ کا پھیرانا نہ ہو۔ ساتھ برس سے اوپر عمر تھی۔ مگر حال یہ تھا  
 کہ جب تک رہیں بارہ مہینے لکڑی ہاتھ میں برقع سر پہ چلی آ رہی ہیں۔ تانی جان ہزاروں  
 روپے کی آدمی تھیں۔ بسکے کے شگے اشرفیوں کے بھرے پرے تھے مگر جمعہ والے  
 دن دوپہر ہی سے ان کی راہ دیکھنے بیٹھ جاتی تھیں۔ خالہ وحیدی کی آن یہ کہ  
 ایک آن کا پانوں کا مٹھا ہمیشہ ہاتھ میں لیکر گئیں اور نانی جان کا شوق یہ کہ صورت  
 دیکھتے ہی پسکیں۔ اور دروازہ میں جا کر پاؤں لئے پھر کیسی گھل گھل کر اور بل بل کر گھنوں  
 بانیں ہوتی تھیں کہ دیکھ کر بھی تعجب ہوتا تھا۔ مزایہ تھا کہ جب تک وہ بیٹھی رہتی  
 تھیں ممکن نہیں کہ کسی دوسرے کام میں مصروف ہو جائیں۔ ہمارا بچن تھا ہم کو  
 ان کی صورت دیکھ دیکھ کر مہسی آتی تھی۔ ماموں جان نے ایک دفعہ اتنا کہہ دیا  
 تھا کہ خالہ سے پیچھے باتیں کر لینا پہلے میرے کپڑے نکلوا دو۔ اس پر اتنی باڈیں کہ  
 تین دن تک وہی کپڑے پہنے اور چوڑا سے پھرے۔ مگر انہوں نے کپڑے نہ دئے۔  
 جب چوتھے دن قصور صحافت کر دیا اور عہد کیا کہ آئندہ نہ کہوں گا تو رخصتی ہوئیں۔  
 رشتہ نہیں، نانا نہیں، کنہ نہیں، برادری نہیں۔ مگر چھوٹے سے بڑے تک سب کا منہ  
 خالہ خالہ کہتے خشک ہوتا تھا۔ ایک ان کے ساتھ کیا۔ ہم نے سب کے ساتھ ان کو  
 اسی طرح ملتے دیکھا اور بات کرتے سنا۔

سمیعاً گھر کی لونڈی تھی۔ اس کی لڑکی پانچ برس کی مری۔ رات بھر مریے کو  
 کلیجہ سے لگائے بیٹھی رہیں۔ اس کا میاں اتنا نالائق تھا کہ شادی ہوتے ہی طوطی کی  
 طرح دیسے بدل گیا کبھی برسوں چھٹے مہینے ایک آدھ دن کو بھیجتا، مگر جب وہ بیمار

بچہ کو لئے ڈولی سے روتی اتر ہی اور اُس کے میاں نے اُکر کہا بیگم صاحب دیکھئے  
تو سہی یہ ڈنڈا کو کیا ہو گیا۔ تو اپنے ہاتھ سے کچھونا بچھا لڑکی کو ٹھادیا۔ خود دوا  
میس کر دونوں وقت پلاتی تھیں۔

میری آنکھیں جو سماں دیکھ چکی ہیں وہ اب نظر نہیں آسکتا۔ دل ان صورتوں  
کو نگاہیں ان چہروں کو اور کان ان باتوں کو تڑپا رہے ہیں۔ ترس رہے ہیں اور  
پھر دک رہے ہیں۔ میرے ماموں جان کی شادی ہے۔ دیگیں اگنا فی میں رکھی ہیں اور  
آپ مونڈھے پر بیٹھی کھانا تقسیم کر رہی ہیں۔

بیچید ایک بن بابا کا بچہ نو دس برس کا ہو گا۔ پچاس روپے کی لہپ کی  
جوڑی ہاتھ میں لئے آیا اس کی بھی خطا نہ تھی اور نانا جان کو بھی معلوم نہ تھا۔ انہوں نے  
اُس میں جوڑی بھی نوکر کے ہاتھ اس بہ وقت نے پہلے تو دوچار آوازیں ماموں کو دیں۔  
مگر شادی کا گھر۔ سچے بال بک رہی تھیں۔ سننا کون تھا۔ اڑ کا اتفاق سے پہنچ گیا۔ اسے  
ہاتھ میں دیدی۔ بچہ نام کا تو لڑکا تھا۔ مگر بھر کچھ ہی تھا خوش خوشی سے آیا۔ چوتھے  
پر چڑھ رہا تھا کہ پاؤں پٹا اور دونوں چھن۔ سے گریسیاؤں ٹکڑے ہو گئے۔ نانی جان  
دیگ تھیں۔ مگر نانا جان کا غصہ بہت تیز تھا۔ شیشے ہی آگ بگولا ہو گئے اور دلا مار کو  
پکر مردانہ میں لے گئے۔ خدا جاسے ادھر مو اکرتے یا کھال اوجھڑنے اللہ نانی جان کو  
بخشے۔ مہانوں کو چھوڑ پر دہ کر و امر دانہ میں پہنچیں اور کہتے لگیں۔

”صوبہ داس صاحب اس بد نصیب بچہ نے اپنی بہ وقت سے دونوں لہپ چھین  
تیل پڑنا تک نصیب نہ ہوا ضرور توڑے مگر جس وقت تم اس کا ہاتھ پکڑ کر چلے ہو وقت  
اس کی نظریں جن میں بیگناہی کا غم تھا تمہارے چہرے پر تھیں۔ میں اس وقت اس کے  
دل کی کیفیت دیکھ رہی تھی۔ اس کا بدن کانپ رہا تھا۔ اس کی زبان خاموش تھی اس کی  
آواز نکلتی نہ تھی اور اسکی حالت اس وقت کا لے کی سی تھی جو قصائی کے قبضہ میں تیرے پیر کی۔

دیکھ کر سہم رہی ہو۔ میں جانتی ہوں یہ مصدوم ہمارے پیٹ کی اولاد نہیں۔ مگر اس کی یتیم صورت، اس کی خاموش آنکھیں، چپ ہنسی اور اب بھی ہمارے رحم کی خواستگار ہیں۔ یہ ایک مظلوم انسان اور ایک بیگناہ ہستی ہے جو اس وقت ہمارے قبضہ میں ہمارے بس میں ہے۔ ہم کو اختیار ہے کہ ہم ماریں نہیں۔ سزا دیں۔ چھوڑ دیں۔ اس کے سر پر باپ کا سایہ ہے۔ زمان کی شفقت، اس کی تکلیف سے، اس کی مصیبت سے باپ کا دل، ماں کی مانتا متاثر ہونے والی موجود نہیں۔ مگر آج وہ دن ہے جو ہزاروں اراکانوں۔ سینکڑوں مندوں سے ہم کو میسر آیا اس خدائے برحق نے ہم کو یہ خوشی عطا فرمائی جس کی مخلوق اس وقت ہمارے رحم کی منتظر ہے اور جو خود ہماری حالت کا مطالعہ کر رہا ہے۔ صوبہ سردار صاحب اس کے قبضہ میں کچھ نہیں یہ رو کر چپ، سہلہ کر خاموش اور پٹ کر ساکت ہو جائے گا۔ مگر اس کی آنکھ کا ہر آنسو، اس کی آہ کا ہر حصہ بہت وزنی ہوگا۔ یہ بے بس کی فریاد اور بیکی کی شکایت ہوگی۔ اس سرکار میں اور اس دربار میں جو ازلی وابدی ہے۔

صوبہ سردار صاحب بہت نازک وقت ہے للہ اس بچے کو کیچو سے لگا لے لے لے اور اُدھر نگاہ اٹھا کر دیکھئے وہ آسمانی بادشاہت کا راج کریندا لا تخت حکومت پر نظر آئے گا۔ اس سے التجا کیجئے اور ہم سے آمین کہلوایئے کہ اپنے حبیب کے طفیل اپنے رسول کا قصد اس طرح ہمارے گناہوں کو معاف کرے اور ہم پر رحم کرے۔

ہم سب کو ٹھٹھے پر کھڑے یہ باتیں سن رہے تھے۔ تانا جان بننے لگے تو اس کو خونخانی جان لے گلے سے لگالیا اور ساتھ لے کر آئیں۔ پاس بٹھالیا اور کھانا نکالنے لگیں۔ کچھ رات زیادہ آگئی تھی دہیں پڑ کر ڈھیر ہو گیا۔ رات کا ایک بج ہو گا کہ کھانا نکال کر خود کھا رہے بیٹھیں۔ بچہ کو جگایا پہلے اس کو کھانا کھلایا۔

کیا وقت تھا۔ بچہ کھانا کھا رہا تھا اور وہ اپنے ہاتھ سے اس کو پانی



دے رہی تھیں۔

کبھی اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی تھیں کبھی اس کو چمکارتی تھیں۔

جب بچہ کھانا کھا کر لیٹ گیا۔ اس کے بعد گمنائی میں آئیں۔ یہ خبر نہیں کیا۔  
مگر گرگڑا کر دغا مانگی اور پھر اگر خود کھانا کھانے بیٹھیں۔

## نواں باب

جس طرح زاہدہ کی شادی کا اختیار از ابتدا تا انتہا ساجدہ کو تھا۔ اسی طرح شاہدہ کی شادی کے متعلق اس کی مجال نہ تھی کہ وہ دم مار سکے۔ رقعہ آیا۔ بچہ بھال بات چیت کچھ نہ ہوئی۔ صرف ایک شام کو اتنا معلوم ہوا کہ کل شاہدہ کا نکاح ہے۔ ماں نے اتنا تو کہا کیا کہہ رہے ہو۔ مائیں بھی نہ بھجواؤ گے۔ مگر جب یہ سنا کہ تم ان باتوں میں دخل نہ دو اور ایسی لغو رسم کا ذکر اب میرے سامنے نہ کرنا۔ تو خاموش ہو گئی۔

دوسرے دن سہ پہر کو مہمان آنے شروع ہوئے مگر کون؟ ماں کا ملنے والا ایک نہیں۔ باہر باپ کے ملنے والے اور اندر رڑکی کے!

ایسی حالت میں غریب دخل ہی کیا دے سکتی تھی اور اس کی رائے کو پوچھتا کون تھا اور اگر ہماری رائے غلط نہ ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو کچھ ہوا اس کا بڑا حصہ خود وہیں کے مشورے اور سہیلیوں کی صلاح ہے۔

المختصر شاہدہ مسترحسن بن اور میکے سے ودارع ہو سسرال جا پہنچیں۔ ایم ڈبلیو حسن ڈاکٹر تونہ تھے۔ مگر ڈاکٹر سی کی تعلیم کیا اسٹے وود فہرہ ولایت گئے اور دونوں دفعہ جیسے گئے ویسے آگئے خوشحال باپ کا بیٹا تھا۔ روپے کی کمی نہ تھی۔ مگر سو اس کے کہ نام مسلمانوں تھا شروع سے آخر تک اور گھر سے باہر تک کوئی

چیز اسلام کی نہ تھی۔ لباس۔ خوراک۔ رہتا سہنا۔ کھانا پینا۔ ملنا جلنا۔ بون چان  
 غرض ہر فعل اور ہر قول مسلمانوں سے سینکڑوں کوس دور تھا۔ اور اسی پر بس نہ  
 تھی۔ غضب یہ تھا کہ روزہ دار جاہل اور نمازی بیوقوف سمجھے جاتے تھے۔ تیس  
 یہیں تک ختم ہو جاتا تو خیر، اگلے دانہ کے سیدھے سادے مسلمانوں کا نوہ مضحکہ اُڑتا  
 تھا کہ خدا کی پناہ۔ برائیاں اُن میں ہوتی تھیں۔ بیوقوف وہ بنتے تھے، بربادی قوم  
 کا سبب وہ، جہالت کا باعث وہ، افلاس کی وجہ وہ، غرض کوئی عیب کوئی خرابی کوئی  
 نقص اور کوئی بُرائی ایسی نہ تھی جو ان میں نہ ہو۔ یہ رنگ میں پچیس برس سے  
 مشر حسن کے خاندان پر چھایا ہوا تھا اَلْجَنَّتُونِ لِلْجَنَّتِ خَدَائِیْ فیصلہ ہے۔ گاڑے  
 میں گاڑے اور زریفت میں زریفت کا پیوند ٹھیک ہوتا ہے۔ میاں بیوی کے  
 خیالات کی وہ میزان پٹی کہ سبحان اللہ۔ آٹھ نو سو روپے ماہوار کرایہ جاؤ اور کا  
 تھا۔ دو سال گاؤں علیحدہ تھے۔ روپیہ کی کچھ کمی نہ تھی۔ بچے صرف دو حسین اور حسینہ  
 اور دو میاں بیوی، چار دم جن میں اب ایک اور بڑھ گیا پانچ آدمیوں میں ڈپرٹھ  
 ہزار کے قریب آمدنی نہایت بے فکری اور اطمینان سے بسر ہوتی تھی۔ چار ماہیں دو  
 چھوکر یاں۔ اندر خانساں۔ باہر ساتیس اردلی۔ خرپورے کو دیکھ کر خرپورہ  
 رنگ پکڑتا ہے۔ ماؤں کا یہ حال تھا کہ چھو کر بھی دروازہ پر آتی تو کہتی کہ ساتیس  
 سے بولو گاڑی کھینچے۔ اب شاہد کی روزانہ زندگی یہ تھی:-

آٹھ بجے کے قریب سوکر اُٹھتی۔ پانگ پر بیٹھے بیٹھے چائے کی پیالی اور دو  
 انڈے کچھ توس کھاتی۔ اس کے بعد غسل خانہ جاتی۔ نہادھو کر باہر آتی۔ بال بنواتی  
 کپڑے پہنتی اور ڈاک دیکھتی۔ کھانا کھاتی۔ اخبار پڑھتی۔ سو جاتی۔ اُٹھ بیٹھتی۔  
 منہ ہاتھ دھوتی۔ لنگھی کرتی۔ کاب جاتی آتی۔ اخبار پڑھتی۔ کتاب لکھتی۔ باتیں کرتی سو جاتی۔  
 دوڑھاتی سال تک یہی سلسلہ جاری رہا۔ ماس کے نام سے تو اُس کو ہمیشہ

نفرت رہی اور ماں کے ساتھ ہی زراعت دشمن تہ نہیں۔ مگر کچھ ایسی دوست بھی نہ تھی۔ ہاں سو غفلتوں کا عقلمند اور دانا دل کا دانا وہ باپ تھا جس نے بیٹی کو اپنا دیوانہ بنا دیا۔ ہفتہ میں ایک دوسرے اس سے ملنے کو اجازت آجاتی اور دنیا دکھاوے کی شرم یا پیٹ میں رکھنے کا لحاظ کچھ بھی تھا۔ کھڑے کھڑے ماں کو بھی صورت دکھا جاتی ورنہ وہ بیسکے کے نام سے متغیر اور صورت سے بیزار تھی۔ حد یہ ہے کہ دو برس شادی کو ہو گئے۔ دکھ سکھ بھلی بُری صحت علالت سب کی طرح سے گزری مگر اس نے ایک دن کیا ایک لمحہ کیلئے مایا بہن کا آنا اپنے گھر پر گوارا نہ کیا۔ یہاں تک کہ ایک چھوڑ دو دو زچہ خانے ہو گئے۔ پہلا کچھ خالص آٹھ روز زندہ رہا۔ پیدا بھی ہوا تھا مگر جینے میں یا مرنے میں ماں نہ آسکی۔ گھر بیٹھے بیٹھے ماتا کی ماری ہر چند جلی اور تڑپڑائی۔ مگر وہاں جلنے کی اجازت نہ ملی۔ اس لئے کہ معقول پرٹھے لکھے شریف مشیار سمجھ دار آدمیوں میں جاہل پھوٹو حشی نالائق آدمی کے جانے سے سوائے بدنامی کے کیا حاصل۔ دوسرا بچہ نرس کے طفیل نانی کے ہاں آجانا اور دونوں دیکھ لیتیں مگر دوسرے کیونکہ ایسا نہ ہو کسی کی بُری عادت بچہ پر اثر ڈالے یہ کچھ جس روز سے پیدا ہوا اس روز سے ایک نرس کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ تعلیم جدید نے جہاں دنیا کیسوں سے بہت سے نقص دور کئے ہیں وہاں دودھ بھی ماؤں کے سینے سے خشک کر دیا ہے کہ بھیر بکری کا شیوہ ہے۔ پھر بھلا شاہنشاہ کے واسطے اس سے زیادہ کسر نشان کیا ہوگی کہ وہ کلب میں بیویوں کے سامنے بچہ کو گود میں لئے چھاتی سے لگائے بیٹھی بیٹھی اور بچہ چُسر چُسر کر رہا ہے۔ بچہ ابھی پیدا بھی نہ ہوا تھا کہ اتنا مقرر ہو گئی۔ گو وہ نوم کی ایسی ہی کوٹھن چارہ تھی۔ مگر گھر والوں کے یہ ختنے دیکھ سمجھ گئی کہ نبھار مشکل ہے۔ اس سے پہلے کلکٹر صاحب کے بچے کو دودھ پلا چکی تھی۔

ایک ہفتہ کا نوٹس دے ٹھیک ساتویں دن سبکے سلسلے بچہ کو چھوڑ سیدی

ہولی بہتیرا حسن اور شاہدہ سنت خوشامد کرتے رہے۔ مگر اس نے خاک نہ سنی  
آخر شاہدہ اپنی اگلی طبیعت پر آئی اور کہنے لگی۔

”ہم تم کو پولس میں بھیج دے گا۔ ہمارا بچہ بھوکا مرے گا۔“

اتنا ”ایسی ایسی پولس میں بھیجنے والیاں ہیسپیوں دیکھ لیں ہم نے اسی  
واسطے نوٹس دیا تھا اور تم سے پہلے پولس میں رپورٹ اور میم صاحب ذکر کر دیا ہے۔“  
اب آگے نقلی میم صاحب کیا بول سکتی تھیں وہم ہی تو ہو گئیں اور اتنا اپنا ستر  
سنبھال سیدھی ہولی۔

اتنا کے جاتے ہی میاں بیوی، سب سند، سب ہی کے چھٹے چھوٹ گئے سوچا  
یہ خفا کہ جا کہاں سکتی ہے بجتی ہے کہنے دو۔ یہ خبر نہ تھی کہ اتنا بچ کی میم صاحب  
چاروں طرف تلا توپ ڈالی، نوکر چھوڑے۔ مائیں گئیں۔ ہر سمت تلاش کیا۔ ایک ایک  
سے کہا۔ لیکن اتنا بازار کی مٹھائی تو تھی نہیں کہ مول آجاتی۔ بارہ گھنٹہ کا دن صاف  
آنکھوں میں کٹ گیا اور چھ مہینہ کا بچہ بھوکا پیاسا دودھ کو بلکتا اور اتنا کو ترستا  
رہا تعلیم یافتہ گروہ میں سے تو کوئی کام نہ آیا۔ ان کو ضرورت نہیں کہ مدد کریں نہ کسی کو  
حق کہ تکلیف دے۔ ہاں ماں نے جب سے یہ خبر سنی۔ مچھلی کی طرح ترپ گئی۔ جب شام  
تک کچھ انتظام نہ ہوا تو زاہدہ سے کہنے لگی ”بیٹی لائیں ماں کے ہاں ہواؤں۔ وہاں  
شاید کوئی اتنا مل جائے۔“ زاہدہ نے اس رائے سے اتفاق کیا تو ماں کو کیفیت جا کر  
سنائی۔ انہوں نے کہا ”بیٹی اتنا کا ملنا تو ایسی بڑی بات نہیں بستی ہی موجود ہو کر ڈیرھ برس  
کا بچہ گو دیں دودھ پنی رہا ہے۔ بغیر بھی نہیں دو پرے کی رشتہ دار ہے مگر شاہدہ کا  
نام ایسا نکل گیا ہے کہ سب کانوں پر ہاتھ دھر رہے ہیں۔ بستی ہے تو غریب اور مصیبت  
ماری۔ نگوڑی ایسی ساندھ ہوئی ہے کہ صورت دیکھ کر جی کر ہٹتا ہے۔ خاصی کمائی مٹی ایک  
میاں کے مرنے سے دودھ والوں کو محتاج ہو گئی۔ نوکر ہی تو وہ کیا کر گی۔ کجنت کہی گھر

سے نکلی نہیں ہاں میرے کہنے سے دو چار دن کے لئے چلی جائے گی۔ جب تک آتا کا انتظام ہو۔ مگر ایسا غضب نہ ہو کہ بی شاہکی اپنے میم پنے میں کوئی ایسی دلی بات کہہ بیٹھیں۔ چاہیٹی ذرا بستی کو تو بلالا۔

دونوں ماں بیٹیوں نے بستی کو بلکر رضا مند کیا۔ پہلے تو بستی انکار کرتی رہی جب اصرار سے بڑھ گیا تو کہنے لگی۔ ”خالہ جان اچھی بات ہے مگر میں نوکر سی تو کرتی نہیں اپنا بچہ سمجھ کر دو چار دن کو وہاں کے طور پر چلی جاتی ہوں۔“

بستی کو رضا مند کر اُسی وقت ڈولی منگوا پرچہ لکھ ماں نے شاہکی کے پاس بھیج دیا۔ اور مسٹر شاہکی حسن کے صاحبزادے ماشرخسن بستی کا دودھ پینے لگے۔ اپنے مطلب کے دیوانے بھی سمیٹا لے ہوئے ہیں پھر شاہکی تو ماشا اللہ سوسرئوں کی سرتی تھیں۔ اپنی عرض باولی اپنا مطلب اندھا جی کھول کر خاطر کی۔ زبان بھی ٹھچی۔ باتیں بھی اچھی۔ دوسرا انتظام چار دن کیا پندرہ دن بھی نہ ہوا تو بستی کو کہنا پڑا۔

”بیوی اب مجھے رخصت کیجئے۔ میں تو صرف چار دن کو کہہ کے آئی تھی۔“

یہ ذرا بیڑھی پھر تھی۔ رخصت اور فرعونیت اگر طہیت ہے تو ہر وقت ہو۔ یہ کیا اپنے وقت پر تو منوبلائی بن گئے۔ اور جب اپنی غرض نکل گئی تو ماش کے آئے کی طرح اکر رہے ہیں بستی بچاری سیدھی سداوی مصیبت زدہ سات پانچ اور دھوکا فریب جانے کیا اور سمجھے کیا۔ شاہکی نے اس کی سادگی سے فائدہ اٹھایا اور ایسا پیشے میں اتارا اور وہ داگ دیا کہ ہاں کرنی پڑی اور کہہ دیا کہ:-

”اچھی بات ہے آپ آتا کا انتظام نہ کیجئے میں دودھ پلا دوں گی۔“

باتوں میں تخیل اور خوشامدوں میں کمی تو دوسرے ہی روز سے شروع ہو گئی تھی مہینہ میں روز تو رنگا ہی اور تھا بستی دیکھ دیکھ کر تعجب اور حیران ہوئی جاتی تھی کہ باتو

جناب جناب کہہ کر منہ خشک ہوتا تھا یا جناب سے تم، تم سے بستی اور بستی سے اتنا بن گئی۔ مگر زبان دسے پکی تھی۔ اور سمجھتی تھی کہ یہ زبان وہ چیز ہے جس سے بیٹا بیٹی پرائے ہو جاتے ہیں۔

اول اول تو آٹھویں دسویں جب جی گھرا یا اور جی چاہا گھنٹہ دو گھنٹہ کو گھرائی۔ مگر پھر تو شاہد نے وہ رعب بٹھایا کہ ضرورت بھی ہوتی تھی تو اجازت لینے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔

وقت کی بات ہے کہ جاڑے ختم ہوئے اور گرمی شروع۔ ابھی رات کی سردی خاصی باقی تھی کہ بخار چپکے اور بخار کے ساتھ کھسر اس غضب کی کہ خاصے اچھے کھیلنے والے شے تین تین چار چار دن میں پٹ پٹ ہو گئے۔ غضب یہ تھا کہ بچہ ہی پر بس نہیں ساٹھ ساٹھ سینٹھ سینٹھ برس کے بڑھے بڑھیاں اس میں چل بیسے۔ بستی کا لڑکا تشریف دو برس کا تھا اور طریقہ چھوٹی آنکھ کا دیدہ اس کے کاسر۔ بستی کی زندگی کا سہارا اور دنیا کی تمام امیدیں جو کچھ تھیں وہ یہ بچہ۔ اسی کے اوپر رہنا پکا کٹ رہی تھی اور اسی امید پر جیتی تھی کہ بڑا ہو کر سب مصیبتوں کی تلافی اور رنجوں کا معاف شدہ کر دے گا۔ بچہ کپکپاتا آ کر ماکہ گود میں پڑ گیا۔ ساتھ تو اس کا اسی وقت ٹھنکا تھا مگر ایک آدمہ گھنٹہ بعد تو جسم کی یہ حالت کہ چپے بھونکے نو بیہرانی اور پریشانی کیسی۔ ناشا کی ماری کی جان نکل گئی۔ چاروں طرف بچہ کو گود میں سے سٹ پٹاتی پھری۔ کبھی اس سے کبھی اس سے دیوانوں کی طرح ایک ایک سے پوچھتی، ایک ایک کو دکھاتی، ایک ایک سے صلاح لیتی۔ اس کے دل کی تو یہ حالت تھی۔ شاہد کو اپنی پٹمی بستی کے پاس آئی اور کہا:-

"اتنا اس کو کھسرانکے گا اور یہ سب گھر میں پھیلے گا تم اس کو فوراً علیحدہ کر دو اور اپنی ماما کے پاس بھیجو۔"

بستی۔ "واہ بیوی واہ کیا کہہ رہی ہو! کس دل سے بھیدوں اس کو تو وہاں بھیدوں اور میں یہاں پڑی رہوں ایسا مجھے کیا لالچ واہ؟  
شاہدہ۔ "ایسا ہونا چاہیے۔ اور ہو گا۔ تمہارے بچہ کی وجہ سے ہم اپنا گھر بیمار نہیں کر سکتے۔"

بستی۔ "بیوی میں کب کہتی ہوں کہ تم اپنا گھر بیمار کرو۔ تمہارا گھر تم کو مبارک ہو میں اپنے بچہ کو لیکر چلی جاتی ہوں۔ ذرا ڈولی منگوا لوں۔"  
شاہدہ۔ "تمہارا بچہ کا جینا نہایت ضروری جس کو چینیہ کا کوئی حق نہیں۔ باپ اس کا نہیں۔ تم خود مفلس فقیر اور ہمارا بچہ بھوکا رہے تو تمہاری بلا سے۔"

بستی۔ "تو پھر جو آپ کہتے وہ کروں۔"

شاہدہ۔ "تم یہاں سے ہرگز نہیں جاسکتیں۔"

بستی۔ "اور میرا بچہ؟"

شاہدہ۔ "اس کو جانا پڑے گا۔"

بستی۔ "واہ بیوی واہ کیا بات کہہ رہی ہو؟"

شاہدہ۔ "سچ کہہ رہی ہوں۔"

ابھی یہ فقرہ ختم نہ ہوا تھا کہ مسٹر حسن اندر آئے اور بیوی نے کہا:-

"ذیر حسن اتا کے بچہ کو بخار ہے اور چھپک معلوم ہوتی ہے اس کا یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔ اس کو فوراً نانی ماں کے ہاں بھیج دیجئے کہ وہ اس کی نانی کو دیدیں۔"  
بستی۔ "واہ بی واہ میں خود لے کر جاؤں گی۔"

شاہدہ۔ "تو ہرگز نہیں جاسکتی۔ ہمارا بچہ بھوکا روئے گا۔"

بستی۔ "روئے گا تو میں کیا کروں۔"

شاہدہ۔ "گستاخی مت کر۔"

اب شاہل آگے بڑھی۔ بچہ کو زبردستی گود سے چھین آدمی کو دیا کہ فوراً لے جائے۔ بستی بچے کے ساتھ جاسکے واسطے چلی۔ مگر آدمی نے اس کو اندر کر دیا اور شاہل نے کہا "تو اگر گئی تو عمر بھر جلیانہ میں سرسے گی ہمارا بچہ کوئی وجہ نہیں کہ بھوکا رہے۔" چونکہ ایسے بیمار بچہ کو شاہل نے ہاتھ لگایا تھا۔ جس کو چپک کا اندیشہ تھا پورا غسل کیا اور باہر اگر جب دیکھا کہ امنا کی ماری چاروں طرف ٹکراتی پھرتی ہے تو نہایت غصہ سے کہا۔ اس فضول جھگڑے سے کچھ فائدہ نہیں۔ کیوں دوسروں پر نشان کیا۔ لے پہلے نہا اور پھر بچے کو دودھ پلا۔

اپنے سامنے نہلا دودھ پلوا بچہ ترس کو دیا اور خاص طور پر باہر کے آدمیوں کو تاکید کر دی کہ اتنا نہ ٹکھنے پائے۔ دو یا تین مرتبہ غریب نے جانے کی کوشش کی مگر کام رہی۔ مجبوراً سرکڑ کر بیٹھ گئی۔

بستی کا بچہ شریف جب نانی کے پاس پہنچا تو شاہل اور شریف کی دونوں نانیاں ششدر رہ گئیں۔ سبب پوچھا تو نوکر کچھ بتانہ سکا۔ حیران تھیں کہ بیمار بچہ کو نوکر کا دے جانا اور بستی کا نہ آنا آخر معنی کیا رکھتا ہے۔ بچہ کا یہ حال تھا کہ بخار خوب زور کا تھا مگر دوبرس کے بچے کی بساط ہی کیا۔ آنکھ کھلتی تھی تو اماں اماں کہہ کر کپکارتا تھا۔ موصوم کی اس حالت پر شاہل کی نانی کا دل مگڑ گیا۔ ڈوبی منگوا سیدھی نوادی کے پاس پہنچیں۔

پہلا روز پہلا اتفاق بلکہ شادی کے بعد نانی نوادیوں کا پہلا آئنا سنا تھا۔ بستی تو ان کی صورت دیکھتے ہی دوڑ کر روتی ہوئی پیٹ گئی اور پوچھا۔

"خالہ جان میرا بچہ کیسا ہے؟"

"دیکھئے تو یہی میرے شریف کو نکال دیا کہ وہ بیمار ہے اور مجھے تہیں جانے دیتیں باہر پہرے بٹھا دئے کہ میں نہ ٹکھوں۔"



نانی - "بیٹی چل تو میرے ساتھ چل پیار بچہ تڑپ رہا ہے۔ لو کہ نہیں چاکر نہیں۔ اس ظلم پر کمر باندھی۔"

شاہدہ - "تو کیا آپ کی رائے یہ ہے کہ میرا بچہ بھوکا مر جائے۔"

نانی - "مرضی اللہ کی اگر مر جائے تو مگر اپنا بچہ کیوں چھوڑے۔ تم کو دس ہزار دفعہ غرض تھی اس کو رکھا ہوتا۔ اب یہ اکیلی کیوں رہے۔ چل بستی کھڑی ہو۔"

غریب کے اوپر سب شیر ہوتے ہیں۔ نانی کے سامنے اس لئے نہیں کہ وہ نانی جنس بلکہ اس لئے کہ بگڑا ہوا انسان بھیرا ہوا شیر ہو جاتا ہے۔ شاہدہ اور احسن دونوں چپکے کھڑے دیکھتے رہے اور وہ بستی کو ساتھ لے ڈولی میں بٹھا سیدھی ہوئیں۔ قدرت کے کارخانے بھی عجیب ہیں۔ بستی جس وقت چلی ہے تو اس کی آنکھ سے زار و قطار آنسو کی لڑیاں بہ رہی تھیں۔ رستے بھر دعائیں مانگ رہی تھی اور کہتی تھی۔

"الہی اپنے حبیب کا طفیل میرا بچہ تندرست ہو جائے"

بلہاتی ہوئی اتر سی بچہ کو گود میں لیا۔ کلیجہ سے چمٹا یا تو بخار ہلکا تھا۔ صبح تک بخار کا پتہ بھی رہا۔ اور بچہ خاصی اچھی طرح ٹہلنے لگا۔

ادھر یہ گزری، ادھر جو عینہ یا بندہ، انا کا انتظام ہو گیا اس کے دودھ کی آزمائش ڈاکٹر نے کی۔ چپک کا دودھ تھا احتیاطاً انا کو نہلایا دھلایا نئے کپڑے پہنائے۔ بچہ کو دودھ دیا مگر نہ معلوم دودھ میں کیا زہر تھا کہ حلق سے اترنے ہی بچہ بخار میں لوٹھ ڈاکٹر آئے، لیڈی ڈاکٹر آئی۔ الغرض دو دن اور دو رات یہ نانا تا بندھا رہا تیسرے دن دیکھا تو بچہ پر چپک کا جال پنا ہوا ہے۔ اب البتہ دیکھنا تھا کہ کون کون احتیاط کرتا ہے اور اس کے سامنے بھی بات قائم رہتی ہے یا نہیں، لیکن افسوس وہ نشوں شاں دوسروں ہی تک تھی اپنا بچہ پڑا تو حسن اور شاہدہ کے دونوں احتیاط وغیرہ سب بھول گئے۔ چپک دلتے بچے کو دونوں کے دونوں پیٹ پیٹ کر روتے اور چمٹ چمٹ کر پیار کرتے گرمی کا موسم بخار اس

غضب کا کہ ہاتھ نہ دھرا جائے۔ ڈاکٹروں اور لیڈی ڈاکٹروں نے ہر چند نسخے بدے اور دوائیاں تبدیل کیں۔ مگر بخار نے جنبش نہ کی۔ شاہد اب بچہ کو خود اپنے ساتھ لیکر سوئی تھی اور سوئی کیا خاک تھی رات بھر روتی تھی سینکڑوں اور ہزاروں مرتبہ اس کو فتح ہوتا تھا پھر تھی تھی کہ پسینہ آ رہا ہوگا۔ مگر بدن تو تانا بنا تھا کہ دیکھنے کے سوا کچھ تھا ہی نہیں بیہوش کی گرمی۔ بخار کی حرارت۔ چھپک کا اترا تر معصوم دماغ کہاں تک صحیح رہتا۔ سرسام ہو گیا۔ یہ بھی عجیب وقت تھا۔ بچہ گردن دے دے پٹکتا تھا۔ آنکھیں بند تھیں اور آواز پر شکل تمام نکلی سکتی تھی۔ اس وقت ما کا یہ فعل بھی کچھ کم قابل بیان نہ تھا کہ بچہ کی کیفیت دیکھ کر اس نے نرس سے کہہ دیا کہ "تم اپنے پاس رکھو مجھے دیکھ کر تکلیف ہوتی ہے۔" نرس کی ماتا نہیں رشتہ نہیں مانا نہیں۔ سرسام میں گرفتار معصوم اکیلا پڑا، سر دھننا اور کوئی آکر جھانکنا تک نہیں۔ نرس اکثر بیٹھی رہتی مگر بعض دفعہ ضرورتاً اور کبھی کبھی خواہ مخواہ اکیلا پڑا چھوڑ کر چلی جاتی۔ یہ حالت چار روز اور چار رات رہی مگر گھر کے کسی آدمی کو آکر جھانکنا تک قسم تھا۔ نرس تھی۔ یا بچہ۔ چوتھی رات بچہ کی حالت اول شام سے ہی خراب ہو گئی تھی۔ آج آدھی رات کے وقت بچہ نے آنکھ کھولی مگر افسوس وہ آخری موقع تھا ان ہی آنکھوں سے جو بیٹھ چکی تھیں چاروں طرف دیکھا اور ایک ننھی سی سبکی کے ساتھ ہمیشہ کو بند ہو گئیں۔

بچہ کے مرتے ہی شاہد وحسن کا پہلا کام یہ تھا کہ مردے سے دُور بھاگ گئے غسل دین لو کروں نے کیا۔ مگر ہاں شاہد اس صدمہ سے جو فطرتی تھا محفوظ نہ رہ سکی۔ اس نے کوشش میں کمی نہ کی۔ لیکن جس قدر بھلائی تھی اسی قدر بچہ کی صورت زیادہ یاد آتی تھی۔

ماں شاہد کے حالات سے بے خبر نہ تھی۔ ارادہ کرتی تھی کہ خود جائے اور سمجھائے مگر ہمت نہ پڑتی تھی۔ زیادہ تر اس وجہ سے بھی کہ وہ جانتی تھی۔ جاؤ گی۔

سمجھائے مگر آؤں گی رنجیدہ۔ لیکن مانتا تھی اس حالت کو سن سن کر کلیجہ کٹتا تھا۔  
آخر اُس نے یہ خط بیٹی کو لکھا :-

”بیٹی شاہدہ کو ماں کی طرف سے بہت بہت دعا۔

بچہ کی موت کا جواثر تم پر ہوا وہ صحیح اور جو حالت تمہاری ہوئی  
وہ درست، تم اس صدمہ میں جو کہو وہ بکا اور جو کرو وہ جائز۔ مگر یہ  
جو کچھ ہوا، ہو رہا ہے، قدرت کے ادنیٰ کرشمے اور دنیا کے معمولی  
کھیل ہیں۔ معاملہ خالق اور مخلوق، حاکم اور محکوم کا، اور مقابلہ  
زبردست اور کمزور، شیر اور بکری کا ہے۔ قطرے کا اگر ٹنا دریا ہے  
ساٹنے پر کا پھیلنا پہاڑ کے روبرو۔ حماقت اور رنجیت کے سوا کیا  
ہو سکتا ہے۔ قدرت کا فیصلہ خالق کا انتظام، عالم کا نظام، بے  
معنی نہیں کچھ وقعت اور حقیقت رکھتا ہے۔ مجبور کے معاملہ میں اختیار  
کمزور کے سامنے طاقت، مفلس کے روبرو دولت، اگر داغِ صبح او  
راسے صائب ہو تو اس زبردست ہستی کا پتہ دیں گے جس کی سلطنت  
اور حکومت ابدی اور ازل سے۔ یہ امتیاز برتری اگر خیال دہشت  
اور قیاس محقول ہے تو پتہ دیں گے اور دکھادیں گے کہ عزت  
میں ذلت اور دولت میں نکبت پوشیدہ اور پنہاں ہیں مگر درستیاں  
مظلوم صورتیں اور مصوم انسان۔ اگر نظر وسیع اور آنکھ گہری ہو تو  
ہاتھ پکارے علی الاعلان اور باوازا بلند فدا کے نعرے اور انقلاب  
کے نشے لگا اور گارہے ہیں۔ چین کا ہر پھول، پھول کی ہر گھڑی، بہار  
کا موسم، موسم کا ہر قطرہ، خوشی کی گھڑی، گھڑی کا ہر لمحہ، خزاں اور  
بربادی رنج اور مصیبت کا پیام ہے۔ کاشا رہی ہو جو بچکیں۔ او

لے رہی ہو جو دے دیا۔ غریبوں کی آہ، یتیموں کا نالہ، بیوہ کی فریاد  
خالی جانے والی نہیں۔ ان مظالم کی انتہا اور ان زیادتیوں کی حد ہے۔  
کیا تم کو وہ وقت یاد نہیں جب تمہارے ہاتھوں ایک بڑھیا ماما۔  
ایک محصنہ، بچی رحیمہ اور منیرا دونوں بھوپتی بھتیجیاں حوالات میں  
پہنچیں، اور رات کے بارہ گھنٹے اس کو اسی لڑکی نے جو تمہارے گھر پر  
تمہاری دبیز پڑھولی میں بیٹھ کر آئی، اور برقع اوڑھ کر اترتی، سپاہیوں  
کی گالیوں اور ظالموں کی جھڑکیوں میں گزار دے، تمہارے دونوں  
شکار ظالموں کے پنجہ میں تھے رات ان کے سر پر تھی اور بکیوں کا  
وارث کوئی نہ تھا، وہ تمہاری نگاہ میں تمہاری رائے میں مجبور بے بس جو  
کچھ بھی ہوں، مگر ان کے سر پر ایک وارث تھا، ایک مالک تھا، ایک حاکم  
تھا، وہ جس کی عزت تم سے زیادہ، جس کی طاقت تم سے بڑی، اور  
جس کی حکومت تم سے وسیع۔

میں اس خیال سے اس وقت بھی کاپنی اور اب بھی کانپ رہی  
ہوں کہ بستی کا بچہ پھلر و سا لال، کلیجہ کا ٹکڑا، ماں کی گود سے چٹا  
ہوا، تمہارے جفا کار ہاتھوں نامستول چکلیوں اور خود غرض ترکیبوں  
سے کیسی مصیبت میں پھنسا۔ ماچھ کی صورت کو ترستی رہ گئی اور بچہ پا  
کی آواز کو پھر کتنا نکال دیا گیا۔ میں خوب جانتی ہوں کہ تمہارے دل پر  
تمہاری طبیعت پر تمہارے دماغ پر اس کا رتی بھرا اثر نہ ہو مگر اس ظلم کا  
انجام اس سختی کا نتیجہ جو کچھ ہونا تھا وہ ہوا۔ خدا کا فیصلہ خاموش اور  
اس کی لاشی بے آواز ہے۔ تم کو آج معلوم ہو گیا کہ مانتا کیا ہوتی ہے  
اور بستی کے دل پر کیا گزری ہوگی اور اس کا کلیجہ کس طرح کٹا ہوگا،

خدا نے دکھایا اور دنیا نے بتا دیا کہ جس کا کوئی نہیں اس کا بھی کوئی ہے اور جو بظاہر کچھ نہیں وہ حقیقت کچھ ہے۔

دنیا نے تمہاری عقل پر اور زندگی نے تمہاری آنکھ پر نوحہ اور تمکنت کے پرے ڈال دیے اور تم اس خدا سے جو عزت والا، قدرت والا، طاقت والا، قدرت والا ہے ایسی فرشتہ اتنی بیزار اور اس قدر متنفر ہو گئیں کہ کبھی بھول کر بھی یہ خیال نہیں آتا کہ یہ طاقت رب ہے والی اور یہ دولت کئے والی نہیں۔ حکومت عارضی اور دولت فانی ہے۔ جوانی مہان اور طاقت چند روزہ صحت کے ساتھ علالت و موت کے ساتھ افلاس۔ خوشی کے ساتھ غم اور آزادی کے ساتھ قید و البستہ ہیں۔ کبھی سوچو اور غور کرو کہ رحیم پر کیا گزری۔ منیر پر کیا بستی کیا پستی اور تشریف کیا کہتا ہوگا۔ میں کہتی ہوں اور محبت سے کہ یہ طیرہ غلط ہے راستہ ٹھیک اور یہ ٹھیک اچھے نہیں۔ شاہنشاہِ دربار خدا سے جو حاکم حقیقی ہو اور لرزائے روحوں سے جو کمزور لاچار ہیں۔ بچہ محصوم تھا بھگت گیا جو بھگتنی تھی۔ یہ جو کچھ ہوا کچھ نہ تھا۔ دنیا کی مصیبتیں، زندگی کی اذیتیں ابھی بہت ہیں سنبھلو اور گر سجدے میں آسکے آگے جو باوقشا ہو کا بادشاہ ہے اور گر گڑا اس کے حضور میں جو انکوں کا مالک ہے کٹر دل کو مارِ ظالم غصہ کو مسل، نوحہ کو غارت اور خود بینی کو دور کر پیل اس رستہ پر جو سیدھا اور اس دگر پر چھان ہے۔ وقت باقی ہو اور توجہ موجود۔ گر گڑا اندامت کے آفتوں سے۔ روضہ مندی کی التجاؤں سے جا اپنے قدموں سے۔ گرا پنی آنکھوں سے۔ جھکا اپنے سر سے جیسا کہ آگے۔ منیر پر کے روبرو اور بستی کے سامنے۔

شاہدہ! گود میں اٹھا کلیجہ سے لگا نیم شریف کو جو تیرے حکم سے بچھڑا اور خدا کے حکم سے ملا۔

## نواں باب

زاہدہ کی طرف سے تو باپ اس قدر غافل اور اتنا الگ تھلگ تھا کہ کبھی بھول کر بھی اس کی نشاۃ الی کا اُس کو خیال نہ آیا۔ ماں البتہ اس رنج میں گھلی جاتی تھی ایک آدھ دفعہ میاں کے منہ پر کہا بھی۔ مگر اس بھلے مانس نے اس کا نشانہ اور اس کاں اڑا دیا اور اگر کبھی بہت ہی بھرپور ہوا اور بھوسی کی پریشانی کو قابل لحاظ اور سوال کو لائق جواب سمجھا تو اتنا کہہ دیا۔ ”مجھ سے صلاح یا مشورہ تو درکنار میرے سامنے ذکر کی بھی ضرورت نہیں۔ تم جانو تمہارا کام جو میری بیٹی تھی اُس کا میں نے کر دیا۔ اب یہ تمہاری بیٹی ہے۔ یہاں جی چاہے کرو اور جس طرح دل چاہے انجام دو۔ نکاح کے وقت شریک ضرور ہو جاؤں گا۔ جو لڑکے میرے علم میں ہیں یا جن کو پسند کرتا ہوں یہ بد نصیب ان کے قابل نہیں، جو نا لائق ہیں وہ ایسے ہی ٹیٹو بچے ہوں گے میں سبچوں تو بیوقوف اور غور کروں تو دیوانہ۔“

بیٹی تو بہر حال بیابانی تھی میاں کی بے اعتنائی کا نتیجہ یہ تو ہو ہی نہ سکتا تھا کہ ماں زاہدہ کا کوٹھر بھر کر اربٹھائے رکھتی۔ چاروں طرف تداو پ مچا لی۔ خدا خدا کر کے ایک بڑا لڑکا انٹرٹس پاس اوسط درجہ کی آمدنی۔ بہت سے سادھے لوگ جاہل ٹھوٹ نہ بائبل جیٹا بہاور۔ میاں سے مذکرہ کیلنگریب وہ تیرہری پر بل ڈال کر خاموش رہا اور جواب نہ دیا تو ہاں کر لی اور تالیخ ٹھہر گئی۔ نکاح سے پانچ روز پہلے زاہدہ یوں مٹھی۔ شاہدہ حقیقی بہن تھی اور اس کی شرکت نہایت ضروری مگر اس نے نہیں بلکہ دل لگی کرنے اور مضحکہ اڑانے باپنے بیٹی کو بلوا بھیجا۔ چنانچہ پہلے ہی روز کہ لڑکی کو مایوں بیٹے چند گھنٹے گزرتے ہوئے

دونوں باپ بیٹیوں نے اس طرح نکتہ چینی شروع کی۔

شما ہرہ۔ ”کیوں ماں جان کیا بغیر مایوں کے نکاح جائز نہیں ہے؟“

باپ۔ ”بیٹی تم کو نہیں معلوم یہ تو اسلام کا خاص حکم ہے۔“

شما ہرہ۔ ”اے ہے ماں جان تو میرا نکاح تو ہوا ہی نہیں۔“

باپ۔ ”ہاں بات تو ٹھیک ہے اپنی ماں سے فتویٰ لو۔“

ماں خراما تھی اور ہر تہ بیٹی کی مفارقت کا اثر اس پر شوہر کے کچھ کے، اس پر ختم

مشاہدہ کا ضحکہ اپنی طرف سے ہر چند ٹالا بہت دیر تک خاموش رہی مگر حساب یہ

دیکھا کہ دونوں کے دونوں جان ہی کو آگئے تو بیٹی سے تو نہ بولی۔ مگر شوہر سے کہا

”اس میں شک نہیں کہ خدائے تم کو اور تمہاری بچی کو ضرورت سے زیادہ عقل

اور حد سے بڑھ کر علم دیا مگر اس کے یہ منی نہیں کہ تمہارے سوا دنیا میں جتنے ہیں وہ

جاہل اور بیوقوف۔ اگر اپنی قدیم روایات پر قائم رہنا اور بزرگوں کی تجاویز پر عمل کرنا

جہالت ہے تو مجھ کو اس بیوقوفی پر ناز ہے۔ میں بیوقوف اچھی اور جاہل بہتر لیکن تمہاری

عقل اور علم اس بیوقوفی اور جہالت کے مقابلہ میں شاہد تمہارے واسطہ مفید ہوں تو ہو

دوسروں کی واسطہ تو سر اسر مضر اور تقنی تکلیف دہ ہے۔ میں آج بیس برس کی بیاہی ہوں

زیادہ برابر کی دولاڑکیاں آگے۔ نانی بن چکی۔ جوانی ختم اور بڑھاپا شروع ہے مگر جنگ

کسی بزرگ کے سامنے تم سے ہنس کر بات نہ کی۔ تمہاری عقل مندی کا نتیجہ اور تعلیم کا انجام

یہ ہے کہ تین برس کی بیاہی لڑکی تم باپ کے سامنے اپنے نکاح کا ذکر نہیں ہنس کر اور

کھل کھل کر کر رہی ہو۔ خدا مجھ کو یہ وقت نہ دکھائے کہ اپنی باپ کے سامنے ایسی بے غیرت

بنوں۔ مجھے اس سے انکار نہیں کہ تمہارے ہاں اکثر رسمیں جو دوسروں کی لگتیں اور بہت

سی باتیں جو اوپر اوپر سے داخل ہوئیں قابلِ لعنت اور لائقِ ملامت ہیں لیکن وہ طریقہ

اور وہ تدبیریں جو رملے دے سب انکڑوں عمروں کے تجربے اور میسوں برس کے غور و فکر

کے بعد چھوڑ گئے اُن پر مٹنا اور بُرا بتانا کھلی ہونے لگی ہے۔ بے غیرتی کا تو علاج نہیں مٹنا اپنا زبان اپنی جس کو چاہو بُرا کہو جس کو چاہو بھلا۔ مگر بات کہو تو مستحکم اور کام کرو تو درست۔ یہ کیا جو مٹ میں آیا وہ کہہ دیا۔ زور پر آئے تو پھول کو پتھر اور سونے کو مٹی بنا دیا مایوں کی رسم جس کا خاکہ اُڑا رہے ہو قدامت کا جو سر ہے اگر سمجھتے اور غور کرنے تو نتیجہ یہ نہ ہوتا جو مفتاح حق کا ہوا۔

مایوں کی خوبیاں مجھ سے سُناؤ اور خود ہی فیصلہ کرو کہ یہ جو کچھ میں نے کیا بجا کیا۔ یا بجا۔ قربان جائیے ان پاک رُوحوں کے جو زندگی کے کیسے کیسے کٹھن رستے اُدھکیسی کیسی منہ لیں اس خوبصورتی سے طے کرنی بتا گئیں۔

آج تک یہ تو تم بھی دیکھ رہے ہو کہ اگر شادی کا ذکر بھی آجائے تو شریف بچیاں وہاں سے اٹھ کر دُور چلی جاتی ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ حیا ایمان کا جزو ہے۔ وہ لڑکی جو چار روز بعد شوہر کے پہلو میں بیٹھنے والی ہے کس دل سے چار آدمیوں کے سامنے آنکھ ملا کر بات کرے۔ یا اپنے دل کی کیفیت دکھا کر اور اپنی حالت سُنا کر یہ بتا دے کہ میں تو اس دن کو ترس رہی تھی۔

اسلام کا فیصلہ یہ ہے کہ ایمان ہے تو جہان ہے اور شرم ہے تو ایمان ہو ہم مسلمان ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہماری لڑکیاں شرم و حیا کی دیویاں ہوں کہنے یہ ہماری رسم ضروری ٹھہری یا نہیں؟

ہمارے دل کا تمدن اس درجہ خراب اور ناقص ہو گیا ہے کہ شادی کے موقع پر چاروں طرف سے خواہ مخواہ کے فتنہ پرداز لوگ پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور جن باتوں کا سر نہ پاؤں دل سے جوڑ کر کھڑا کر دیتے ہیں۔ کوئی بیٹی والوں کو بھڑکانا اور کوئی بیٹے والوں کا بہکانا اپنا فرض سمجھتا ہو۔ ایسی حالت میں کیا یہ ضروری نہیں کہ لڑکی ان فتنوں اور لُچر باتوں سے متاثر نہ ہو اور یہ فتنہ پرداز یاں اس کے کان تک نہ پہنچیں۔



ایک کواری لڑکی جو پندرہ سولہ برس یکے میں رہی اب اس گھر سے وداع ہوتی ہے اس کی زندگی کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ بلکہ زندگی اب ہی شروع ہوتی ہے کیا وہ یہ حق نہیں رکھتی کہ اس کو مہلت دیدی جائے کہ وہ تخلیق میں بیٹھ کر اپنی آئندہ زندگی کے متعلق کچھ غور کرے اور طے کرے کہ اس کو آگے چل کر کیا کرنا اور کس طرح رہنا ہے؟ مایوں کی ایک غرض یہ بھی ہے کہ لڑکی کا رنگ روغن خوب نیکھے اور اس کو اچھی خوراک دی جائے کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ اس کو جو کچھ کھلایا پلایا جائے اس طرح سب کی آنکھ بچا کر؟

یہ میں نے نہایت مختصر طور پر تمہارے سامنے دو تین ہی باتیں بیان کی ہیں۔ مگر جب تم جیسا کہ عورت کے واسطے فضول سمجھتے ہو تو میں جھوٹی اور تم سچے۔  
میاں بیوی کی بیوقوفی اور بیٹی ماکی جہالت پر ہنستے اور ٹھٹھکے لگاتے رہے یا نکاح کے وقت تک اعتراضوں کا سلسلہ برابر جاری رہا مگر مائے مطلق پرواہ نہ کی اور اب زاہدہ بھی سسرال جا بیٹھیں۔

## دسواں باب

وداع کے دوسرے روز چالا تھا۔ شاہد اس رسم کو کس طرح جانتا سمجھتی۔ اس سنے ماں کے سامنے باپ سے کہا۔  
”بابا اب تک تو جو کچھ ہوا وہ ہو گیا۔ اماں جان کی ذات سے متعلق کھٹا اور اس کا اثر بالواسطہ یا بلاواسطہ ان ہی پر پڑ رہا تھا۔ لیکن اب ان کے خیالات ایک دوسری زندگی سے واسطہ رکھتے ہیں یہ وداع کوئی نئی وداع نہیں ہے۔ میں بھی آخر یہی گئی تھی یہ بھی کوئی انسانیت ہے کہ دلہن کو گئے چو میں گھنٹے بھی نہیں ہوسے اور طلبی کا تقاضا موجود! کچھ روز ان کو وہاں رہتے دیکھئے کہ میاں بیوی ایک دوسرے کی عادت

خصلت خوبوں سے واقف ہوں، اشد ضرورت ہے کہ آپ اس معاملہ میں ذل دیں اور دہن کو ابھی نہ بلائیں۔“

**باب۔** ”بیٹی آخر سن تو تمہاری اماں بھی رہی ہیں۔ میں ہی اپنے منہ سے منع کر کے کیا لے لوں گا۔ میں نے تو شروع ہی سے اس کے معاملہ میں اسی واسطے دخل نہیں دیا جو ان کی سمجھ میں آیا وہ کیا۔ اب بھی ذل دینا نہیں چاہتا۔ جو ان کا جی چاہے کریں۔“

**شہادہ۔** ”اما آپ اتنی سی موٹی بات بھی نہیں سمجھ سکتیں کہ شادی کے بعد یہاں بیوی کو ساتھ رہنے کی کس قدر ضرورت ہو۔ کوئی وجہ نہیں کہ آپ ان کو تاج بلا لیں۔“

**ما۔** ”خدا کا شکر ہے کہ میں مسلمان ہوں اور آباد اجداد کے وہ طریقہ جو موجودہ زمانہ کی کسوٹی پر بھی پورے اُتر رہے ہیں۔ میرے سر آنکھوں پر ہیں۔ مجھ کو میری بچی دیکھ رہی نہیں کہ میں اُس کے شوہر کو اور اس مندروں کو یہ یقین دلا دوں کہ اس کا کوئی مراجعت والی وارث نہیں۔ لڑکی گھر کا کٹرا تھی کہ نکال باہر کیا۔ وہ درحقیقت کلیجہ کا ٹکڑا ہی ہو سکی تھا۔ دی قانون فطرت تھی۔ پورا آگرویا۔ مگر جیتک ما باپ زندہ ہیں اس کے دکھ سکھ، رنج و راحت سے غافل اور بے خبر نہیں اور ان کا فرض ہو کہ شوہر کو یہ یقین لادیں کہ بیوی قیدی بن کر میرے قبضہ میں اور لونڈی بن کر میرے گھر میں نہیں آئی۔ یہ دہن جو اسوقت ہمارے گھر کی رونق ہو دوسری آنکھوں کی پتلی اور دوسرے دلوں کا سرد بھی ہے ہم کو یہ معلوم کرنے کی بھی ضرورت ہے کہ شوہر کے تعلقات سسرال والوں کے بڑا واس کے ساتھ کیسے رہے۔ وہ ناخبرہ کا رہے۔ یہ ہے اگر کسی معاملہ میں وہ صلاح کی محتاج ہو تو اپنے بچہ سے واقعات سن کر رائے دیں کہ جو کچھ پڑ گئی وہ کس طرح سلجھے۔ رستے بڑی بات یہ ہے کہ ہماری بچیاں اتنی بے غیرت اور ایسی بے شرم نہیں کہ کہہ لو میاں مفتوح اور گھر سنبھالوں اپنا، دو گھنٹہ کی دہن اس گھر میں اور ان لوگوں میں جس کو اور جن کو پہلے دیکھا تنگ نہیں۔ دسترخوان پر بیٹھ رکابی صفا چٹ کر دے اور حکم دے ”اور لاؤ“ دوسرے

سے میاں کے سامنے ہڈیاں چھوڑے اور ساس نندوں کے روبرو منہ چیر چیر کر اور پھاڑ پھاڑ کر بوٹیاں چبائے۔ بچاریاں کہنے سننے سے ایک آدھ لقمہ کھا سکتی ہیں۔ اس کو شرم کہو، حیا کہو، جذباتی کا اثر۔ فراق کا نتیجہ جو چاہے سمجھ لو، تم ایمان سے کہو کہ جب پالا پڑے اُن لوگوں سے جو ایک ایک ادا اور ایک ایک حرکت کو نگاہ میں رکھیں اور سابقہ ہوان لوگوں سے جو کھانے پر پیٹ پر پیٹنے پر اوڑھنے پر غرض ہر کام پر اور ہر بات پر رائے دیں اور خیال ظاہر کریں تو احتیاط ضروری ہے یا نہیں؟ ایمان نہ نکلے خدا کے واسطے یہ تو بتاؤ کہ مغرب جس کا کلمہ پڑھ رہے ہو کیا وہ ان کو ساس نندوں کے ہاتھ میں چھوڑ دیتا ہے؟ وہاں صرف میاں پیوستی ہوتے ہیں مگر یہاں دو لہا کے تمام عزیز، دوست بھی اور دشمن بھی۔

اس واسطے یہ چالوں کی رسم مقرر کی گئی جس کی بڑی مصلحت یہ بھی ہے کہ وہ ان کے ساتھ، دو لہا کے تعلقات بھی سسرال والوں سے بڑھنے شروع ہوں۔ میں نے ساری عمر میں تمہارے میاں کو دو یا تین مرتبہ دیکھا ہے۔ تم بتاؤ کہ اس کو کیا خبر کہ مجھ کو اس کی محبت ہے بھی یا نہیں۔ حالانکہ ضرورت ہے اور اس لئے بیٹی دیکر بیٹا بیٹے ہیں کہ ہم اس کو بھی بتا دیں کہ تیری محبت اپنی بچی سے کم نہیں۔ جس طرح نکاح نے ہماری بچی کو مادی اسی طرح ہم کو بیٹا۔ تم ان باتوں کو کیا جانو اور کیا سمجھو؟

## گیارہواں باب

زاہرہ کی شادی کو سال بھر سے زیادہ ہو چکا تھا۔ دونوں بابا بچپوں کے فرض سے سبکدوش ہو کر اپنی اپنی جگہ خوش تھے۔ اختلاف مزاج کی وجہ سے انہیں اختلاف رائے کے سبب کبھی کبھار دونوں میں کچھ کھٹ پٹ سی ہوجاتی تھی ورنہ اس

نیک بی بی کا ضبط و تحمل اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ وہ جو کچھ بھی کرتا اور جو کچھ بھی کہتا صبر سے دیکھتی اور شکر سے سنتی۔ میاں نے یہ کوشش ہمیشہ کی بلکہ عمر بھر کی کہ بیوی اسکی مرضی پر رہے اور صلاح پر کام کرے۔ مگر خرابی یہ تھی کہ جن باتوں کو وہ عیب سمجھتا تھا یہ ہنر اور جو اس کی نگاہ میں برائیاں تھیں اس کے خیال میں بھلائیاں۔ کبھی کبھی ایسا ہوا کہ دونوں کسی خاص معاملہ پر بحث کر رہے ہیں مگر نتیجہ کچھ نہ نکلتا۔ وہ اپنی کہتا یہ اپنی۔ قابل وہ ہوتا نہ یہ۔

جاڑوں کے موسم میں ایک روز دوپہر کے وقت انا منہیاری بغل میں ٹوکرے لئے آئی۔ گھر والی صورت دیکھتے ہی کہنے لگی۔

"اُتا ہو سلام۔ کل سے دو دفعہ بلا چکی ہوں دیکھو تو سہی سونٹا سے ہاتھ

پرٹے ہیں۔"

اُتا بہو۔" بیوی۔ کیا بتاؤں جب آنکھوں میں پانی اُترتا ہے صاف تو دکھائی دیتا نہیں۔ مگر دسی کے سہارے چلتی ہوں۔ اب تمہاری صورت دھندلی دھندلی دکھائی دے رہی ہے۔ کیا آؤں۔ ٹھوکرے، دھکے، بڑھاپے کے دن ٹیڑھا سودا۔ گر پڑوں تو چوٹ لگے سوائگ، نقصان ہو وہ جُرا۔ اس لئے نکلتا ہی چھوڑ دیا تمہاری صاحبزادی کا ذکر دو دفعہ آیا۔ پرسوں وہاں گئی تھی۔ جا کر بھی پچھتائی۔ ان چوڑیوں سے تو اُن کو نفرت ہی ہے۔ میرے منہ سے نکلا بیٹی تجھے سنگے ہاتھوں دہم بھی نہیں آتا۔ ارے بیوی وہ صاف بگڑ گئی اور کہنے لگی۔ وہم کس چیز کا۔ کیا شوہر کی موت اور زندگی چوڑیوں پر موقوف ہے۔ عبد اللہ جیسی چوڑیاں پہنا گیا تھا ایسی ہوں تو ریشمیں دے جاؤ۔" خیر میں نے چوڑیاں پہنا دیں۔ ہاتھ ماشا اللہ پورا ہڈی وار پانچ ٹوٹیں جب دو چڑھیں 'دو آنہ کی چوڑی دس آنہ گرہ سے دیکر چار آنہ کی پیس۔ انہوں نے پہلی ہی چوڑی پر کہہ دیا تھا۔ جو ٹوٹے وہ منہیاری کی۔ ادھر چوڑی چٹ ہوئی ادھر وہ

کھٹکھٹا کر سنیں۔ خیر میں جلتی رہی اور پہنائی۔ جب پہن پان چلنے لگیں تو نوکر سی دیکھ  
 کہتی کیا ہیں یہ کالج کی چوڑیاں پہننے والیاں بیوقوف ابھی زندہ ہیں۔ اس پر تو میرے اگ  
 لگ گئی میں نے کہا بیٹی زبان سمجھال کے بولہ بیوقوف ہوگی تم۔ آپ جو اردوں کو بیوقوف  
 بناتی ہو تم سمجھتی ہو ہم عقلمند ہیں۔ پڑھے لکھے ہیں دو انگلیاں مسختے پر رکھنی نصیب نہیں  
 نہیں۔ اگلے زمانہ کے لوگ اس کو فرض سمجھتے تھے کہ لڑکی سرگندھار اور چوڑیاں پہن کر  
 ضرور سلام کرے۔ اب یہ سلام قابل الزام ہیں۔ مگر مجھے ذرا یہ بتا دو کہ پانی کا گاس لیٹر  
 دینے والے سے یہ کیوں کہتی ہو شکریہ۔ پان کسی سے لیکر یہ کس لئے کہتی ہو تسلیم۔ بیٹی  
 یہ وہی فنکاری تھی۔ جو دینے والیوں نے اس طرح لڑکیوں کو بتایا تھا یہ ان ہی کے  
 چبائے ہوئے نوالے انٹ پلٹ رہی ہو۔ تم مجھے ایک کہتیں نہ چار سنتیں۔  
 میں توبہ کہہ کر چلی آئی۔ مگر اب انشاء اللہ نہ جانوں گی۔ سلام کرتیں نہ عا ہی  
 پاتیں میرا کیا لیا۔ اپنا کچھ کھویا۔

منہیاری شریف تھی یا رذیل۔ مگر جو کچھ کہا اس انسانیت اور معقولیت  
 سے کہ باپ جو چپکا بیٹھا سُن رہا تھا۔ اس نے بھی شاہدہ کی یہ حرکت پسند نہ کی اور  
 آج عمر بھر میں یہ پہلا اتفاق تھا کہ اس اللہ کے بندے نے بھی ایک معقول بات  
 سوچی۔ منہیاری چلی گئی تو بیوی سے کہا۔  
 ”اُٹا ہو بات تو ٹھیک کہہ رہی تھی۔“

**بیوی۔** ”تم ہی دیکھو خدا معلوم کس قسم کی کجحت طبیعت لائی ہو کہ کسی سے جھکنا  
 ہی نہیں آتا۔ اسی پیٹ کی بچی زاہدہ ہے۔ مگر دونوں کی طبیعت میں حالت میں  
 عادت میں خصلت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اُس کا بس چلے تو کسی غریب  
 فقیر کو دنیا میں رہنے تک نہ دے۔“

اس کے اختیار میں ہو تو اپنی کھال کی جوتیاں تک حاجت مندوں کو پہنائے۔“

میاں۔ "میں سال سال بھر سے تو یہ سن رہا ہوں کہ شاہد کا لے اپنے اخراجات اس قدر بڑھا رکھے ہیں کہ آمدنی کافی نہیں ہوتی اور چاروں طرف سے قرض لیتا پڑتا ہے اب یہ سنا ہے کہ ہزار روپیہ کا ایک جہڑا تیار ہوا ہے۔ اور کپڑا ہزار سے اس شرط پر دیا گیا ہے کہ اگر تین مہینہ میں روپیہ ادا نہ ہو تو ہزار کے ڈیڑھ ہزار ساس سسوں لے بیٹے ہو کو اسی لئے الگ کر دیا ہے۔ بلکہ میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ حسن بھی بیوی کے ان گٹوں سے پریشان ہو گیا ہے اور اکثر لڑائی ہوتی رہتی ہے۔ پہلی تاریخ کو کلب کا سالانہ جلسہ ہے اس کیلئے یہ تیاریاں ہو رہی ہیں۔ زاہد سے میں ناخوش ہی ہوں مگر حق یہ ہے کہ اس لحاظ سے تو میں اسے پسند کرتا ہوں کہ وہ آمدنی سے خرچ بڑھنے نہیں دیتی اب تو شاید ترقی پر مدلی ہوئی ہے۔"

بیوی۔ "ہاں خدا کا شکر ہے۔ پہاڑ پر ستور روپے دیں گے۔ آج گئے ہوئے ساندیاں روز ہو اگر خط ہے نہ پتہ۔ وہ تو میری طرف سے ایسی غافل ہے نہیں۔ کہہ گئی تھی پہنچے ہی لکھوں گی۔ خبر نہیں کیا بات ہے۔ خدا فیروز رکھے۔ شاہد کا کیا کہنا خدا ہی اس کی حالت درست کرے تو کرے۔ میں تو شرف ہی سے کہہ رہی ہوں کہ دیکھنے یہ اونٹ کس کل بیٹھتا ہے تم نے کبھی میری سٹنی ہی نہیں۔ وہ قرض پر حافظ ہے۔ میرا یہ حال ہے کہ مر جاؤں اور قرض نہ لوں۔"

میاں۔ "میں کل گیا تھا تو حسن بھی موجود تھے۔ مگر چپکے چپکے اور ر کے ر کے جب وہ چلے گئے تو میں نے بالوں باتوں میں سنا دیا کہ خرچ آمدنی کے اندر رہنا چاہیے۔ مگر وہ کیا ایسی تہی تھی فوراً سمجھ گئی اور کہنے لگی ضروری خرچ تو کوئی بھی رک نہیں سکتا سنا سے کہہ دینا آسان ہے۔ آدمی حساب کرے تو معلوم ہو کہ کونسا خرچ فالٹو ہے۔ کپڑا نہ پہنے؟ کھانا نہ کھائے۔ آدمی نہ رکھے؟ گاڑی نہ رکھے؟ چینی جان کے جو خرچ ہیں وہ تو دم ہی کیسا تھ ختم ہونگے۔ معیشت کی زندگی سے تو موت بہتر ہے۔ جیسا کہ

میں نہ ہوں تو کہاں سے اُٹھے ہیں تو ان زندہ گیوں پر تعجب اور تعجب نہیں افسوس کرتی ہوں بلکہ لعنت بھیجتی ہوں جو عمر بھر مصیبتیں جھیلیں اور پاپ پڑھیں کھائیں نہ پیئیں اور جوڑے جوڑے کر دو سروں کے واسطے چھوڑ جائیں۔ مجھ سے اگر کوئی یہ توقع رکھے تو یقیناً غلطی ہے۔ اسی وجہ سے مسٹر حسن ناخوش ہیں لیکن ان کی ناخوشی اتنی بے مصلحتہ اور اس قدر غلط ہے کہ میں اس کی مطلق پروا نہیں کر سکتی اور ایک میں کیا کوئی معقول بیوی بھی نہیں کر سکتی وہ ہوں یا آپ اگر کوئی یہ چاہے کہ ان جاہل بڑی بوڑھیوں کی طرح جو ٹھوک لگا لگا کر دوسرے جوڑتی تھیں میں بھی کھانا پینا اور ملنا جلنا حرام کر دوں تو حاشا وکلاء اس زندگی اور اس دنیا سبک باز آئی۔ انسان دنیا میں مصیبت بھگتنے کو پیدا نہیں ہوا۔ دنیا ہمارے واسطے جنت ہے اور یہ جس قدر سامان مسرت ہیں یہ ہمارے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ بد نصیب ہیں وہ کجنت جو اس قابل ہیں کہ ان اسباب کے فائدہ اٹھائیں مگر نہیں اٹھاتے۔ خدا ایسے ملعونوں کی صورت نہ دکھائے۔ ان سے سابقہ نہ ڈالے۔ میں مسٹر حسن سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ وہ اگر اپنے فرض کے ادا کرنے میں غفلت کریں گے تو نتیجہ کے ذمہ دار خود ہوں گے۔

بیگم میں تو یہ گفتگو سُن کر سنائے میں رہ گیا۔ ایکس بات سراسر ہی طور پر کہی تھی اس کے جواب میں قنچی کی طرح جو زبان چلنی شروع ہوئی ہو تو کسی طرح بند ہی نہ ہوئی۔ بیوی غور سے میاں کی باتیں سُن رہی تھی اور بیچ بیچ میں ٹھٹھے سے سانس بھرتی جاتی تھی۔ بات ختم نہ ہوئی تھی کہ باہر سے ماما نے لاکر خط دیا جس کو دیکھ کر میاں نے کہا۔

”لو زاهدق کا خط ہے“

بیوی۔ پڑھو خدا تعالیٰ جی رکھے۔

میاں۔ تمہارے نام کا ہے۔ تم ہی پڑھو۔

میاں نے خط کھولا اور اس طرح پڑھنا شروع کیا۔

اماں جان کی خدمت میں بہت بہت ادب۔

آپ سے جدا ہو کر یہاں پہنچی۔ کس طرح بتاؤں کہ رستہ کیوں کر کٹا اور دل پر کیا گزری۔ آدھری ہی تھی اور دل آپ کے پاس تھا۔ ابھی پہاڑ ہم سے کوسوں دور تھا کہ سرک پر پہرے ہرے تنادر درخت جڑے اکھڑے دکھائی دئے۔ خیال کیا کہ شاید آدھری آئی ہو۔ مگر ایک ہونڈی ہوں ساری سرک پر آدھری سے آدھری تک درخت ہی درخت تھے۔

جب ہم آبادی کے قریب پہنچے تو آدھری مصیبت نظر آئی نہ آدم نہ آدمی زاد۔ مکانوں کا ستھراؤ ہوا پڑا ہے۔ گاڑی والے نے کہا کہ صاحب کل شام کو یہ خبر سنی تھی کہ پہاڑ پر بھونچال آیا اور اس زور کا کہ تمام پہاڑ الٹ گیا۔ آگے بڑھے تو بیسیوں آدمی مکانوں کے نیچے دبے پڑے تھے۔ عورتیں مرو بچے بڑھے سب ہی تھے، کڑیل جوان، بڑھے پھونس، کچھ

سسک رہے، کچھ ہلک رہے۔ کیسا قیامت خیز منظر تھا جو ہم کو دیکھنا پڑا۔ مصوم بچے ماؤں کے کلیجے سے چپے کے چپے رہ گئے۔ پہاڑ کے بڑے بڑے ٹکڑے۔ کسی کا پاؤں دکھائی دے رہا ہے کسی کی گردن، کہیں بچے کی ٹانگ ہے تو کہیں ماکا سر۔

ایک موقعہ تو ایسا دیکھا کہ میان نہیں کر سکتی۔ ہزاروں لاکھوں میں کا ایک ٹکڑا ایک عورت کی ٹانگ پر پڑا تھا۔ تڑپ رہی تھی۔ مگر دم نہ نکلتا تھا۔ ہم کو دیکھ کر ہاتھ جوڑنے لگی۔ کیا بتاؤں اس وقت دل کی حالت کیا تھی۔ اب تک وہ تصویر آنکھ کے سامنے ہے ہم چار آدمی تھے مگر چار کیا ہزار بھی ہونے تو اس کو سر کا نہ سکتے تھے۔ مجھ کو پاس بلایا اور



کہنے لگی "وہ سامنے مٹی میں میرا صندوق ہے۔ مگر دکھائی دے رہی ہے  
 اس میں دو ہزار روپے کا زیور ہے۔ یہ میری گچی کو بی بیٹا"۔ میں کیا  
 جواب دیتی۔ کہنے لگی "پانی پلا دو"۔ ہمارے ساتھ صراحی تھی میں نے  
 پانی پلایا۔ کوئی دو گھنٹے تک ہم وہاں کھڑے رہے اور ہماری آنکھوں کے  
 سامنے اس کا زم نکل گیا۔ میں نے صندوق نکلوایا کھدلاتو واقعی اس میں  
 زیور موجود تھا۔ آگے بڑھے تو ایک محلہ میں البتہ کچھ آدمی زندہ موجود  
 تھے۔ مگر یہ بھی مردوں سے بدتر تھے۔ کسی کی ہڈی ٹوٹی کسی کا کولہ اُترا  
 کوئی زور ہاتھ کوئی چنچ رہا تھا۔ آگے کے محلہ میں آدمی زیادہ بھی تھے  
 اور زخمی بھی اتنے نہیں۔ مگر کچھ ایسا سہم چڑھا تھا کہ بات تک نہ کر سکتے تھے  
 گنتی کے کچھ مکان اور دیکھے مگر وہ بھی اس حال میں کہ حالت دیکھ کر کچھ  
 منہ کو آٹا تھا مکان رہنے والوں کا اور رہنے والے مرنیوالوں کا کہ ہم  
 بچا رہے تھے پہلے ارادہ کیا کہ اُسے لوٹ چلیں۔ مگر شام کے قریب کھڑی  
 فوج آگئی ذرا اطمینان ہوا اور ہم ایک مکان میں اتر گئے۔

عشما کی نماز پڑھ رہی تھی کہ ایک عورت دیوانہ وار اندر آئی اور چاروں  
 طرف دیکھنے لگی اور کہنے لگی "بیوی اپنے بچوں کا صندوق میرے دونوں گچے  
 دیدو" میں متحیر تھی کہ کیا جواب دوں کہ وہ میرے قدموں میں گر پڑی اور  
 کہا "میرا جوان شیرا گلے برس مجھ سے بچھڑ چکا ہے اب مجھ راند ڈکھیا رہی  
 ہے یہ دونوں بچوں سے ہیں۔ اور میری زندگی ان ہی دونوں سے ہے میری  
 مانتا ٹھنڈی کر دو۔ دل ان صورتوں کو تڑپ رہا ہے۔ اے بی بی میرے  
 بچے ملا دے۔ بچوں والی میرے بچے دکھا دے۔ میرے کیچہ کے ٹکڑے  
 میرے سینہ سے چٹا دے۔ میری آنکھوں کے تارے لا اپنی جوانی کا

صدقہ میری چار سال کی کمائی۔ میری ایک برس کی محنت میں ہاتھ جوڑتی ہوں، قدموں پر سر رکھتی ہوں۔ غریب ہوں بے دارتی ہوں۔ اس کی گفتگو سنکر میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے اس کو بٹھایا کھانا دیا پانی دیا۔ ذرا غفل ٹھکانے ہوئی تو معلوم ہوا کہ اس کے دونوں بچے بھی وہی کر زمین کے اندر پہنچ گئے ہیں۔

خیر یہ تو جو کچھ ہوا سو ہوا۔ اب آپ مجھے یہ بتائیے کہ اس زیور کا کیا کروں۔ مردہ کی وصیت، کنیا کا مال، ایک ایک سے پوچھ چکی کہ کون لے لیا تھا۔ مگر کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اس سہم کے آگے میں تو سب کچھ قبول گئی۔ اس کی بچی کو کہ ہر ڈھونڈوں اور کہاں سے لائوں کہ اس بار سبکدوش ہوں۔ یونہی تمام کام جہنم کے ستے ہیں، بیٹھے بٹھائے میرے اعمال کی اور سزا ملی، آپ مولوی صاحب دریافت کیجئے کہ میں پورکس کو دوں؟ اگر کل کلاں کو اس کی بچی کا پتہ چل گیا تو کیا کرونگی؟ فقط اتنا تو معلوم ہوا ہے کہ مرنے والی کے میاں یہاں جانوروں کے ڈاکٹر تھے اور شاہجہاں پور کے رہنے والے اچھی میری اماں جان کسی کو شاہجہاں پور بھیج دیتے۔ شاید کچھ پتہ چلے۔ ثواب کا کام ہے۔ آنے جانے کا کرایہ وہاں کا خرچ سب میں دوں گی۔ اگر کوئی اللہ کا بندہ یہ تکلیف گوارا کرے تو عمر بھر احسان مانوں گی۔

اب یہاں اللہ کا شکر ہے کوئی کھٹکا نہیں سرکار کی طرف سے سب انتظام ہو گئے ہیں پھر بھی مصیبت ماروں کا کیا حال سناؤں براہ میں جو منشی جی بیٹھے ہیں ان کی بیوی ماوسہ بہن بہترین نیچے ہیں کل سات دم۔ مگر ساتوں کے ساتوں زخمی کسی میں اتنا سکت نہیں کہ

ہل کر بھی پانی پی سکے۔ میں دونوں وقت جا کر ان کے ہاں کارسار کام کر دیتی ہوں۔ ان کے ہاں سے فارغ ہو کر اپنا کام کرتی ہوں اماں جان میرے کیا ہاتھ پاؤں گھس جاتے ہیں خبر نہیں اللہ کو کنسی ادا بند آجائے اور اسی بہانے مغفرت ہو جائے۔

میری دعار گنج العرش اور چھوٹی حامل وہیں رہ گئی ہے۔ یہ بھجوادیجئے۔ آبا جان کی خدمت میں بہت بہت آداب عرض کر دیجئے۔

آپ کی لونڈی

زاہلہ

خط باپ پڑھ رہا تھا اور ماں سن رہی۔ مگر جس طرح دونوں کی طبیعت میں آسمان زمین کا فرق تھا۔ اسی طرح حالت میں بھی۔ باپ نے ہنس ہنس کر پڑھا اور ماسے رو رو کر سنا۔ وہ تو خط پڑھ بیوی کے آگے ڈال رہا تھا چھوڑا ہنستا چل دیا۔ مگر یہ اٹھی وضو کیا دو نفل شکرانے کے پڑھے کہ خیریت کا خط آیا ایک دفعہ پھر کھولا اور پڑھا اور سوچنے لگی کہ شاہجہاں پندرہ کس کو بھجوں اور میرے کہنے سے کوئی جانے کیوں لگا۔ پرائے کارن بلا وجہ بلا سبب کوئی تکلیف اٹھائے تو کیوں اور میں اذیت دل تو کس لئے؟ چلو اماں جان سے کہوں شاید وہ کچھ انتظام کر دیں یہ فیصلہ کر خط ہاتھ میں لے ڈھولی منگو ایک پہنچی اور وہاں کچھ تجویز کر کر بیٹی کو یہ خط لکھا۔

نور چشمی سلیم!

دعا۔ سخت تشویش اور بچہ انتظار کے بعد کل تمہارا خط پہنچا تمہارے باپ نے پڑھا اور میں نے سنا۔ رنج بھی ہوا اور خوشی بھی صدہ بھی

اور اطمینان بھی۔ ان ہزار ہا بندگانِ خدا کی کیفیتِ پڑھ کر جن پر خدا کا یہ عذاب نازل ہوا بدن کے روئنے کو ٹپے ہو گئے۔ مگر جس صداقت کے ساتھ اس مصیبت میں تم مخلوقِ خدا کے کام آ رہی ہو اور اپنی رحمتیں اپنا سکھ اور اپنی ضرورتیں دوسروں کے آرام ان کی آسائش اور ان کی خواہشوں پر قربان کر رہی ہو یہ اسلام کا خاص منشا اور مسلمان کا عین شیعہ ہے۔ خوش نصیب ہوں میں ماں جس کے پیٹ سے تم جیسی بچی پیدا ہوئی اور تعریف کے قابل ہو وہ باپ جیسی نسل میں ایسی لڑکی ظہور میں آئی۔ اپنے ذاتی رنج و راحت سے ہر انسان بلکہ انسان کیا جانور تک متاثر ہوتا ہے۔ مگر انسانیت جس چیز کا نام ہے وہ یہ ہے کہ انسان اپنی تکلیف سے زیادہ اور اپنی خوشی سے بڑھ کر دوسرے کی تکلیف اور دوسرے کی خوشی کو سمجھے۔ مدد دے جو امکان میں ہو اور خدمت کرے جو ہو سکے۔ خدا کے نیک بندے اور خالق کی اچھی مخلوق وہی ہے جو بندوں کا غلام اور مخلوق کا خدمتگدار ہو۔ تم نے اس غضب میں اور اس آفت میں بہت کچھ کیا۔ لے لیا اور پیدا کر لیا۔ کہا ان مطلوبوں کی دعا اور ان بچاروں کی انتہائی نہ جائیگی جو تمہارے ہاتھ کی دونوں وقت پکی پکائی کھا رہی ہیں۔ ان کی دعا وہ دعا ہے جس کے مقابلہ میں اور ان کی انتہا وہ انتہا ہے جس کے سامنے امرار کی دولت اور بادشاہوں کی سلطنت بھی وقعت نہیں رکھتی۔ کئے جاؤ۔ جو کر سکتی ہو اور کرتی رہنا جو ہو سکے۔

نشا ہیما پنور میں نے آدمی بھیج دیا۔ خدا کرے سراسر لگ جائے۔ معاملہ ٹیڑھا اور امانت پیچیدہ ہو مگر جس خدا کے بھروسے پر کام شروع کیا ہے وہی ختم کر دے گا۔

تمہارا رسی ما

## بارہواں باب

تشاہدہ۔ "میں اگر ایک ایک کر کے جہالت کی پہودگیوں کو گنواؤں تو شاید تین چار دن میں بھی ختم نہ ہوں لیکن موٹی موٹی باتیں اگر ملنا تم غور سے دیکھو تو صاف معلوم ہو جائے کہ یہ عقیدہ اور یہ خیال صریح غلطی اور گھٹی ہوئی بے وقوفی ہے۔ کیا مذہب سبائے آپ کو یہ ہی بتایا کہ مسافر سدھارا ہے جھاڑو نہ دو۔"

کیا اسلام اسی کا نام ہے کہ "شام کو دونوں وقت شے ہرے درخت کے نیچے کھڑی نہ ہو۔"

"سُرکھول کر نہ بیٹھو۔"

کیا مسلمانوں کا فرض ہے کہ "پرہیزی سکے سامنے جب وہ سفر سے آیا چاول ضرور رکھیں۔"

کیا یہ مسلمانوں کا عقیدہ ہو سکتا ہے کہ پانی کھڑے ہو کر سپیں تو چالیس دن کا رزق اُڑے گا۔

اور شاہکیں ہلا کر کھانے سے رزق کی برکت ختم ہو جائے گی۔"

افسوس افسوس کیا آپ اس میں بڑی خوبی دیکھتی ہیں کہ جس عورت کے بچے مرجائیں وہ نہا کر اُٹھے تو گلے نہ ملے اس کا لُج لگ جائیگا۔"

ماما کیوں کر یقین آگیا کہ "روٹی سے پیاز کھانی منخوس۔"

"چار پانی کی پائنتی اونچی ہونی منخوس۔"

"عورت کے سفید کپڑے منخوس۔"

کس کس کو دھواؤں۔ ماما آپ کی دُشیا تو ان لٹوپاٹا سے پُرسہ۔ آوی کیا ہوا خدا

ہو گیا کہ سب باتیں اسی کے اختیار میں ہو گئیں۔

”بچہ کو نہلایا کالادانہ جلا دے نظر نہ لگ جائے۔“

مولود شریف ہے۔ اگر یوبان مسلک دو مردوں کی رو میں آئیں گی۔“

”مگے سر جھاڑو نہ دو۔“

”انگلی چھوڑ کر کھانا نہ کھاؤ۔“

اما مسلمان ہونے کی حیثیت سے آپ کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ تعلیم جدید نے اب یہ لحدیت ہم سے دور کرنی شروع کی ہے۔ اور اس قسم کی جہالت اب آپ کو اپنی بہنوں میں بہت کم نظر آئے گی۔ آپ فرما رہی ہیں کہ میں ”گیلے بال نہ سوؤں“ یعنی اسوقت کہ ہمارا اٹھی ہوں ابھی ننگی کروں۔ اور وہ بھی اٹے سیدھے بال نہیں یا نہ نہیں مگر کسی طرح سمٹ جائیں۔ اما اگر بال کھو کر سونا منخوس ہو اور غالباً منخوس ہی ہوگا جو آپ منع کر رہی ہیں تو ایک بات تو بتائیے۔ یہ فقریاں تو بڑی بھاگوان ہوتی ہوں گی جن کو بریل بھی بال کھولنے کی لزبت نہیں آتی۔

پاپا کی یہ ہمیشہ کوشش رہی ہیں نے بار بار چاہا کہ آپ ان پرانے ڈھکوسلوں سے چھٹکارا پا کر ان خیالات پر آجائیں جن کی صداقت آئینہ کی طرح چمک رہی ہے۔ کیا ہم مسلمان نہیں ہیں؟ کیا ہم معاملات کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے ہم ان پرانی نیک بختوں سے جنگی قوم محلہ یا اڑوس پڑوس کے دو ایک گھروں تک محدود تھی بہت زیادہ قوم کی خدمت کر رہے ہیں۔ ہم جس طرح اس شہر کے مسلمان کو اپنا سمجھتے ہیں اسی طرح یہاں سو ہزاروں لاکھوں کوس کے رہنے بسنے والے مسلمان کو بھی بہن بھائی خیال کرنے ہیں۔ آپ خود ہی فیصلہ کیجیے کہ ہماری کوشش قوم کی واسطے کس قدر مفید ہے۔ آپ دیکھ رہی ہیں ہمارے کلب میں ہفتہ وار جلسے ہو رہے ہیں۔ قوم کی یکجہت و افلاس پر کس توجہ سے غور کیا جا رہا ہے۔ دونوں مدرسے جو قائم کئے گئے کس خوبی سے اپنے فرائض ادا کر رہے ہیں۔ سوتے اوپر

لڑکیاں تعلیم پا رہی ہیں۔ یہ لڑکیاں جس وقت پڑھ لکھ کر نکلیں گی آپ ہی فرمائیے کیسی مائیں اور کیسی بیویاں ہوں گی۔“

مال۔ ”بیٹی مجھے تم سے بحث کی ضرورت نہیں۔ تم اپنی رائے پر قائم رہو اپنی پر۔ مجھے تمہارے معاملہ میں دخل دینے کی ضرورت نہ تم کو میرے۔ تمہاری کوششیں اگر قوم کے واسطے مفید ہیں تو خوشی کی بات ہے۔ میں اگر قوم کے واسطے مضر ہوں تو مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔“

بیٹی۔ ”یہ سب بڑی مصیبت ہے کہ جہالت آپ لوگوں کو ایمان کی بات نہیں کہنے دیتی۔ جو خیالات آپ کے دماغ میں سما گئے ہیں اور جو من مٹھادی کی طرح آپ کی گودوں سے دوسروں کو لگ رہے ہیں۔ آپ ان کی خرابیوں کی بھی قائل نہیں۔ جب تک ان کی بیخ کنی نہ ہو ہماری کوششیں بار آور نہیں ہو سکتیں۔“

مال۔ ”اب یہ جہالت ختم ہو رہی ہے اور مجھ جیسی دس بیس بڑی بوڑھیاں باقی ہیں۔ اس کے بعد قوم پوری ترقی کر لے گی۔“

بیٹی۔ ”ایسا ہوتا تو پھر کیا کہنے تھے۔ بیشک اطمینان ہو جاتا مگر خرابی تو یہی آکر پڑ گئی کہ یہ زہریلے خیالات آپ کے بعد بھی دنیا میں موجود رہیں گے۔ ایک بیس بھڑا تھی کہ آپ کے چھندے میں نہ پھنسی۔ مگر دوسری بالکل آپ کا نمونہ ہے اس کے بچے ہو ہو رہے ہوں گے۔ اب فرمائیے آپ کے بعد جہالت کا خاتمہ کس طرح ہوا؟“

مال۔ ”مائوس نہ ہو اسی طرح رفتہ رفتہ کمی ہوتی جائیگی اور وہ وقت بھی آجائے گا۔ جب ہم جیسی جاہل عورتوں کا وجود ہماری اسلامی دنیا میں نہ ہوگا۔“

بیٹی۔ ”لیکن یہ کوشش کیوں نہ ہو کہ آپ ہی اپنے خیالات تبدیل کر لیں اور سمجھ لیں کہ آپ کے خیالات نے مسلمانوں کو کس قدر نقصان پہنچایا۔“

مال۔ ”میں اس معاملہ میں تم سے گفتگو کرنی ہی نہیں چاہتی اور تم خواہ مخواہ سر

ہوئے جاتی ہو۔ مرنے والیاں سو بیوقوف اور تم ہزار عقلمندوں کی عقلمندہی۔  
بحث کی کیا ضرورت ہے۔“

**بیلی۔** ”اسی کی تو اشد ضرورت ہے۔ کل کے جلسہ میں یہ رپز دیوشن پیش  
ہوا اور باتفاق پاس ہو گیا کہ ہر ممبر جہانگ اس کے امکان میں ہو عورتوں کے اعطاء  
کو جو محض جاہلانہ ہیں اور جن کی بدولت قوم اس قدر تاراج و برباد ہو رہی ہو نازل کرنے کی  
کوشش کرے ایسی حالت میں میرا فرض ہے کہ میں سب سے پہلے آپ ہی کی اصلاح کروں  
ضرر ظاہر ہے آپ اس پر اصرار کیوں کرتی ہیں۔ کیا آپ اسلام کی دشمن ہیں۔ اگر آپ  
ان کو اچھا سمجھتی ہیں تو مجھے بھی بتائیے۔“

**مال۔** ”اگر تم اس قابل ہوئیں اور اتنا ایمان تم میں موجود ہوتا تو روٹا ہی کا  
کاٹھا۔ یاد رکھو کہ ان میں اور تم میں فرق یہ ہے کہ وہ خدا کو جتنی قدرت والا کہتی تھیں  
اتنا ہی سمجھتی تھیں۔ ان کو ہر حال میں ہر رنگ میں ہر خوشی میں اور ہر رنج میں خدا دکھائی  
دیتا تھا۔ سخت سے سخت مصیبت میں بھی ان کو یہ ڈر نہ تھا کہ کہیں اس سے بڑی  
مصیبت نازل نہ ہو جائے۔ حد سے زیادہ خوشی میں بھی یہ کھٹکا ان کے دل سے نہ  
ہوتا تھا کہ زبردست قدرت والا اس خوشی کو رنج سے بدلدے۔ کہتے کہ تو میں بھی ادرم ہی  
دونوں ہی خدا کو قادر و قدیر سمجھتے ہیں۔ لیکن ضرورت یہ ہے کہ ہم اپنے قول سے عمل  
بات سے چیت سے یہ ثابت کریں کہ جو سمجھتے ہیں وہ کرتے بھی ہیں۔“

امیر اہیم بودی جس وقت تختِ حکمت پر جلوہ گر تھا اگر یہ سمجھ لینا کہ عین  
کے ساتھ ذات لگی ہوئی ہو اور عت دینے والا ذات بھی دے سکتا ہو تو اسکی ماں جینی نہ  
سے باہر اگر ہمایوں کے قدموں میں گرتی ہوئی تاراج کو ان الفاظ سے نہ لرزادی کہ  
”میں امیر اہیم کی ماں ہوں“

اسی نشین کا نام مذہب ہے جس کو مرنے والیاں ہر شے سے مقدم سمجھتی ہیں۔



اور ان کی گھٹی میں ڈالا جاتا تھا کہ وہ مذہب کی وقعت اور خدا کی عظمت کو کسی حال میں ہاتھ سے نہ دیں۔ اس واسطے ان کیلئے جو تجویزیں کی گئیں وہ مذہب کے دائرہ میں مذہب کے رنگ میں یا یوں سمجھو اس سانچے میں ڈھال کر سامنے رکھ دیں۔ میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ ہم میں بہت سے نقص ہیں اور ان کی اصلاح یقیناً ضروری ہے۔ لیکن اس کچھڑ میں چند جوہر بھی ہیں جن کو تم مانہ سمجھ رہی ہو۔ اور حقیقت وہ کچھ سے لگائے کے قابل ہیں۔ یہ اصول جن پر تم مسترخ ہو باون ٹولے اور پاورٹی کے ہیں۔ تمہاری نگاہ میں اگر مذہب کی کوئی وقعت، تمہارے دل میں خدا کا کچھ خوف، تمہارے دماغ میں اگر رتی بھر عقل اور تم میں اگر برائے نام انسانیت اور خصوصاً سی سی بھی نسبت ہوتی تو تم سمجھتیں کہ ان کی اصلیت کیا اور حقیقت کیسی ہے۔

”مسافر گیا ہے جھاڑو نہ دو“ اس سے مذہب کا کیا واسطہ؟ مگر اس میں جہالت کی کیا بات ہے؟ جانے وقت چیز بست، اسباب بچھونا ہیں چیزیں باہر ہوتی ہیں۔ اگر یہ خیال نہ جادیا جاتا اور جاتے ہی جھاڑو مل جاتی تو چھوٹی موٹی چیزیں جھاڑ دیں کوڑے تک فدا پہنچ جاتیں۔ شاید کوئی اگلوٹھی چھلا پتہ۔ بالی کا غدر پتر بھی غارت ہو جاتا۔ بتاؤ یہ احتیاط کیا بُری ہے؟

چلو آگے بڑھو شام کے وقت ہرے درخت کے نیچے سرکھول کر نہ کھڑی ہو۔ بیٹی یہ تو موٹی سی بات ہے لڑکی بالیاں شام کے وقت سرگوندھتی ہیں اور جب دونوں وقت ملتے ہیں اسی وقت پر مذہب سیرالینے ہیں مگر درخت پر جالور ہوئے جو زیادہ ہرے ہرے درخت پر بیٹھتے ہیں اور بیٹ کر دی تو گندھا گندھا یا سربرباد ہوا یا نہ ہوا؟ خدا کے واسطے بتاؤ تو سہی اس میں جہالت کیا ہوئی؟

”مسافر کے واسطے چاول“ کی جو کہتی ہو دل میں غور کرو اور خود ہی قائل ہو جانا۔ آدھی رات کو مسافر اُترا اور پیٹ سے خبر بھی نہ تھی کہ کھانے کا انتظام ہو جانا۔ فرض کر لو

مہمان امیر ہے میزبان غریب جس کے پاس پیسہ ہے نہ وقت پر انتظام کر سکتا ہے۔  
راست آدھی ہے کچھ انتظام ہو بھی نہیں سکتا۔ میزبان کی غربت کو کس خوبصورتی سے  
ڈھکا نکا ہے کہ صرف چاول پکا کر سامنے رکھ دے۔ ایمان سے کہنا ایک معمولی سی  
بات نے کتنی خرابیوں کو دُور کر دیا۔

پانی کھڑے ہو کر پینے کے نقصانات تو ظاہر ہیں۔ خود طب کی رو سے ثابت  
ہے کہ کھڑے ہو کر پانی پینا مضر ہے۔

اسی طرح پاؤں ہلا کر کھانے کی کیفیت ہے ضرورت ہے کہ آدمی اطمینان سے  
کھائے اور پیے۔ تاکہ کھانا انگ لگے۔ اور جو مقصد اصلی ہے وہ پورا ہونے کہ اور اُٹنا  
کھانا دہرا اور پانی تیرن کر اترے۔

کاش تم کو خدا عقل دیتا اور سمجھتیں کہ عورت نہا کر اُٹھے تو اس لئے کہ اس کے  
بچے مسکے یا مر گیا گلے نہ لگا۔ کتنی مسئول تجویز ہے۔ بچوں کی شرط تو برائے نام ہے بہت کم  
ایسی اشک کی بندیاں ہوں گی جن کا کوئی بچہ نہ مرا ہو۔ احتیاط دونوں کے واسطے ہے  
اور اس لئے ہر عورت ایسی حالت میں گلے ملتی ہوئی ہچکچائے گی۔ اب تم اس کی وجہ  
سنو۔ عورت کے بال نہانے کے بعد خشک نہیں ہوتے اور ان میں پھوٹنے کے بعد  
بھی پانی کے قطرے موجود رہتے ہیں اگر اس سے کوئی بلیگا یا کسی کو ملنا پڑیگا تو بیشک  
کہہ دوں گے خواب ہو نیکا احتمال ہو۔ تم ہی دیکھو کس قابلیت سے اس ضرورت کو پورا کیا  
اس بُرائی کا انسداد کیا کہ دونوں میں ایک کو مار نہ ہو۔

”روٹی پر سپاہ کھلی“ تم ہی سمجھ لو بُری ہے یا نہیں۔ پیاز کس قدر بو کی چیز ہے  
اس بہانہ سے اس کو پاس ہی نہ آنے دیا۔

”چار پانی کی پائنتی“ خود ہی کھڑی کر کے دیکھ لو۔ کیسی معلوم ہوتی ہے اگر اس کے  
منہ سے کہہ کر روک دیا تو کیا گناہ کیا۔

ہاں عورت کے سفید کپڑوں کی بحث ذرا طیرھی ہے۔ میں جانتی ہوں کہ آجکل کی تعلیم یافتہ لڑکیاں غیروں کے دیکھا دیکھی سفید کپڑوں کے شوق میں مبتلا ہیں مگر جنہوں نے سہاگ کے واسطے رنگین لباس مخصوص کیا تھا ان کو بیوہ اور سہاگن میں امتیاز کی ضرورت تھی۔ تاکہ خدا کے حکم بیوہ کے نکاح کی تکمیل باسانی ہو سکے اور بیوہ عورت دیکھ سکے کہ اس کا رٹھاپا باسانی تمیز ہو سکتا ہے۔

ایک دوسری وجہ یہ تھی کہ خود اسلام عورت سے متوقع ہے کہ مردوں کی طرح ہاتھ کے ناخن سفید نہ رکھے، میں تسلیم کرتی ہوں کہ بعض مرد بھی اب سفید لباس پسند کرتے ہیں مگر کثرت ابھی ان ہی لوگوں کی ہے جو عورت کے رنگین لباس کو سفید پر ترجیح دیتے ہیں یہ سیر بھی دیکھ لو کہ جن کی نقل میں سفید لباس پسند کیا جاتا ہو وہ خود رنگوں کے دلدل ہیں۔ ”بچہ کے کالے دانہ کی رسم تمہاری سمجھ میں نہ آ سکی۔ اس سے نظر گذر سے واسطہ نہ سہی مگر اس کا مقصد صرف ہوا کا صاف کرنا ہے کہ بچہ کی ارد گرد ہوا آدمیوں کی کثرت سے خراب نہ ہو یہ ہی کیفیت مولود شریف یا اور مجلسوں کی ہے کہ وہاں آدمی زیادہ ہوتے ہیں ہوا خراب نہ ہونے پائے۔

”ننگے سر جھاڑو دینا کھلی ہوئی نادانی ہے کہ خاک سر میں جائیگی اور اگر سر گندھا ہوا ہے تو اور بھی بال برباد ہوں گے۔“

انگلی چھوڑ کر کھانا تم کو شاید اچھا معلوم ہوتا ہو۔ میری آنکھوں کو تو زہر معلوم ہوتا ہے اور میں اس کو بہت بڑی ہتھیری خیال کرتی ہوں۔

بیٹی ان باتوں پر تم لاکھ جہالت کے آواز سے کس لوگران کی تہ میں ٹھکڑے کھٹے ہوئے پھول دکھائی دیں گے۔ تم مدرسوں کی جو کہنتی ہو تو بیوی جس قدر فیض تمہارے ان مدرسوں سے جاری ہوتا ہے۔ یہ مرنیوالی بیویوں کے ہر گھر سے جاری تھا مشکل سو کوئی معقول گھر ایسا ہوتا ہوگا جہاں ایک آدھ حملہ کی غریب لڑکی پڑھنا لکھنا نہ سیکھتی ہو۔ ہاں تم

یہ اعتراض کر سکتی ہو کہ وہ تعلیم صرف کلام اللہ رٹ لینے کی ہوتی ہے۔ مگر میری بی بی میں تو  
 سب کچھ کی تعلیم یافتہ لڑکیوں کو بھی اس سے زیادہ نہیں دیکھتی کہ خط لکھ لیں اور پڑھ لیں تم نے سنی تعلیم  
 پائی ہے اور میں اس نعمت سے محروم ہوں تمہارا جو جی چاہے خانہ داری کے حساب کتاب کے  
 متعلق مجھ سے دریافت کر لو۔ پیسوں کا، روپوں کا، اشرفیوں کا، آٹے کا، گھی کا گوشت  
 ترکاری کا تم بھی شاید اتنا ہی حساب زبانی بتا سکو گی جتنا میں، لیکن میں اگر تم سے یہ کہو گی  
 کہ ذرا آیت الکرسی تو پڑھ کر سنا دو۔ تو بھلیں جھانکنے لگو گی۔ تمہارا گھر جس طرح رہتا ہے  
 اور جہنم سلیقہ تمہارے گھر سے ٹپک رہا ہے۔ وہ مجھے بھی معلوم ہے۔ جاہل کے گھر سے  
 اپنے تعلیم یافتہ گھر کا مقابلہ کر لو۔ اور فرق کا فیصلہ تم خود ہی کر لو۔ تمہارے ہاں ماہا اگر کسی روز  
 نہ آئے تو اللہ چاہے گھر میں کھیاں بھنگتی رہیں۔ میرے ہاں خدا کا لاکھ لاکھ احسان ہر دم سے  
 ایک آدھ ماہ زیادہ ہی ہے۔ مگر میں جب تک اپنے ہاتھ سے جھاڑو نہ دوں مجھ کو چین نہیں  
 پڑتا۔ نہ کوئی شاید مہینوں بھی باورچی خانے کے جھانکنے کا اتفاق نہ ہوتا ہوگا۔ میں دونوں وقت  
 تمہارے آیا کا سالن خود اپنے ہاتھ سے بچھا رتی ہوں۔ اور اس کو اپنا فرض سمجھتی ہوں تمہارا  
 جس معاملہ میں جی چاہے مجھ سے بحث کر لو۔ یہ تمہارے بآپ بھی بیٹھے ہیں ان ہی پر فیصلہ رہا۔  
 میری آمدنی تمہاری آمدنی سے زیادہ نہیں اور میرا جائز خرچ تمہارے جائز خرچ سے دوگنا۔  
 مگر خدا کا شکر ہے ایک دہیسہ کی قرضدار نہیں۔ بلکہ تھوڑا بہت اللہ کا دیا وقت بے وقت  
 کے واسطے میزے پاس نکل ہی آئیگا۔ بولنے جناب آپ بھی کچھ فرمائیے غلط کہتی ہوں یا صحیح؟

## تیرہواں باب

وقت کی پوری رو، حکومت کا زبردست اثر، مغربیت، ہر ذمی روح اور غیر ذمی  
 روح شخص اور شے سے ظاہر ہو رہی تھی۔ حد یہ کہ زمین کی پیداوار اور ہوا کا کرہ بھی  
 اسی رنگ میں شرابور تھا۔ اس نہر باہل کا اثر اتنی ترقی کر گیا تھا کہ زمین سے پھول اگتا تھا تو

خوشبو سے محروم اور بھوس طائر چمکتا تھا تو نغمہ سے پاک برقی اثر کی طرح یہ رفتار لمحہ بہ لمحہ ترقی کر رہی تھی۔ زاہد کا شہر احسان تھا تو پیرسیدھا اور حد سے زیادہ سادہ گھر وقت کا مقابلہ کون کر سکتا ہے۔ آخر انسان تھا، دل بھی تھا آنکھیں بھی، دماغ بھی اور جوانی بھی۔ عمر گزری اس طرح کہ باپچوں وقت کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھتی اور پس اس کے سوا گھر سے نکلنا قسم اور میر کو جانا گناہ۔ اب جو پہاڑ پر پہنچا اور یہ جھلا چلی کے جلوسے دیکھے کہ ہرف کے ٹکڑے، عورتیں تیرہروں کے ہاتھ میں ہاتھ دسے۔ کوئی برقع میں، کوئی ساڑھی میں، کوئی گاڑی میں، اور کوئی یوں ہی، سبزہ پڑھتی پھر رہی ہیں۔ آنکھیں کھل گئیں۔ نیا نیا آیا تھا اول نو آدمی تھے ہی نہیں اور جب ہو بھی گئے تو چھانٹ چھانٹ کر اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر ملا۔ ان لوگوں سے جہڑانی چال اور دقتیانہ سی خیال کے تھے۔ مگر ایک چھ ہی مہینہ بچا ہوا کی ٹھنڈی ہوا لگی اور منظر دیکھے۔ ایک تو انسان اور پھر نوجوان، طرہ یہ کہ کان میں آئے ترقی کے نعرے، وجہ کیا اور سبب کیا کہ دنیا ترقی کرتی اور احسان نہ کرتا اس احساس کا پہلا نتیجہ اور اس کو کشش کا پہلا انجام یہ تھا کہ جو پیرسی اب تک نعمت اور امرت تھی وہ زلتا اور خضارت کا شکار ہونے لگی۔ یہ تو نہ کر سکا اور کر سکتا بھی نہ تھا کہ ایک دم سے رسی توڑ انگ کھڑا ہو جانا ہاں اتنا ہونے لگا عشا کے بعد مگر بھی گھر سے باہر نہ نکلنے والا آدمی ہفتہ میں دو مرتبہ کبھی تین مرتبہ تماشہ میں پہنچنے لگا۔ نماز گزرتے دار ہوئی۔ وظیفہ ختم ہوا۔ وہ تھا اور سنو رہی پارک۔ مدرسہ کی حاضری مجبوری ہوئی۔ ٹکڑا اسی کی بدولت میل رہا تھا ورنہ اس بس چلتا تو اس قطعہ زمین کو جو نوہ جنت تھا جو میں گھنٹوں میں ایک لمحہ کیلئے نہ چھوڑتا۔ چاندنی رات میں جس وقت ترقی پارک کے ہر قدمہ زمین سے برآمد ہوتی تو آنکھیں روشن ہو جاتیں۔ زاہد کا لاکھ بھولی اور ہزار سیدھی تھی۔ مگر میاں کا رنگ فوراً تار لیا۔ لیکن کیا کر سکتی تھی پردیس کا معاملہ اپنی لوگ، کہتی کس سے اور پوچھتی کیا ترقی کا پہلا زیور بدلتی اور غور نہ ہو۔ احسان نے مستی پہلے طین مومن کی زنجیر توڑ کر خیر کو شہر سے بدلا اور حکم دیدیا کہ

بیوی گھر سے باہر نہ نکلے۔ نا اہل میاں کے سامنے اور اس کے حکم کے مقابلہ میں کسی شے کو قبیح نہ سمجھتی تھی۔ یہ حکم مرا کھوں پر رکھا مگر ہمسائی جس کا کھانا دونوں وقت جا کر بھارتی تھی۔ اس حکم سے سخت مصیبت میں پھنس گئی اور تین چار دنوں پر کڑکے کے فاسے گزرنے لگے۔ پرنسب کے دو ذکرہ گئے تھے اسی حالت میں لڑکتی لڑکاتی گھسیتی گھسٹاتی دوپہر کو چلی چلی دیوار بیچ گھر میں تیسرے پہر پہنچی۔ احسان آڑی ہانگ نکالے، کھف کے ٹن لگا کر ہاتھ کا یہ آواز کان میں آئی۔ بیٹی اپنے ہاتھ پاؤں کا صدقہ میرے ہاں آکر نہیں اپنے ہی اڑال دیا کہ ہم روٹی کو تیز کئے۔ بچے بول بول کر تے پھر رہے ہیں۔ میرے پاس سو ادعا کے کیا دھوا کیا ہے۔ خدا خوش رکھے گا۔ الہی بچی دو دنوں نہائے پوتوں پھلے۔ اس پر ویس میں تیری عنایت نے ہم مردوں میں جان ڈال دی اور ہم مروتوں کو چلا لیا۔ اوپر خدا اور نیچے تو میرے پانچ بچے، میرا لکڑا شوہر، میری دیکھی ہوئی اتنا۔ تجھ کو دعائیں دے رہے ہیں۔ اسے گیم بھوک کی تکلیف سے چھٹکارا دلوا اور پیٹ کی آگ کو ٹھنڈا کر۔

احسان۔ "بس دوسرے کی بھی سُندان کو اتنی فرصت کہاں۔"

عورت۔ "اچھا میاں خوش رہو۔"

احسان۔ "خوش رہنا اور ناخوش رہنا کیا صرف تمہارے ہی کہنے پر ہے؟ عورت اتنا سُنتے ہی پھر نہ بولی اور جن قدموں سے آئی تھی ان ہی قدموں سے الٹی لوٹی۔ احسان کپڑے پہن، سگرت سلگا، چھڑی ہاتھ میں لے، سیٹی بجاتے، باہر گئے۔ مگر نا اہل کے کلیجہ پر جو چوٹ عورت کے بیان سے لگی تھی وہ اتنی گہری تھی کہ اسکی آنکھ سے آنسو نکل پڑے۔ اس نے ہمسائی کو آواز دی اور کہا "اٹا بھیدو، غور نماز پڑھی اور دعا مانگی کہ الہی اگر میری لگی ہو تو معاف کیجیو اور احسان کو اپنے خلیفہ و امان میں رکھیو۔" میاں احسان کی نرقی کی کوشش زبانی جس خرنج نہ تھا۔ کسی دفعہ تصد کیا کہ علی صورت بھی اختیار کر دیں۔ مگر ہمت نہ پڑی آخر ایک دن جی کر کر کے کہہ ہی دیا۔ جلد آج

تم کو بھی تماشہ دکھالادوں کیا یاد کرو گی۔“

احسان کی خواہش جائز تھی یا ناجائز یہ علیحدہ بحث ہے مگر سوال یہ ہے کہ بیوی بھی اس کی اہل تھی یا نہیں۔ بہر حال زاہد کا جیسی بیوی کو جس کی تعلیم یہ تھی کہ شوہر مجازی خدا ہے۔ تعمیل میں کیا عذر ہو سکتا تھا احسان نے کیا اور وہ چلی گئی۔ صبح کو جب احسان سو کر اٹھا تو بیوی سے پوچھا:-

”کہو تماشے کی بابت کیا رائے ہے کیسا رہا؟“

زاہدہ:- ”رائے کیا دوں اچھا تھا۔“

احسان:- ”اچھا سے کام نہیں چلتا۔ تم اس کے فائدوں پر نظر ڈالو انسانائی زندگی میں جو خرابیاں اور نقائص ہیں۔ ان کا انداز کس خوبصورتی سے کیا گیا تھا وہ واہ بُرائی کی تصویر آنکھ کے سامنے پھر جاتی ہے۔ تم نے دیکھا شراب کا نتیجہ کس قابلیت سے دکھایا کہ پھر پینے کو جی نہیں چاہتا۔“

زاہدہ:- ”مگر جہاں بہت سی بُرائیوں سے دل ہٹ سکتا ہے وہاں بعض خرابیوں کی طرف طبیعت کے راغب ہونے کا بھی اندیشہ ہے۔ حُسن و عشق کی داستان جو تمام تماشے کی جان تھی بالکل وہی سنی رکھتی ہے جو آجکل کے ناول۔ جس طرح اس قسم کی لٹو کتابوں کا عورتوں کے ہاتھ میں دینا مضر ہے اسی طرح تماشہ بھی مفید نہیں۔“

احسان:- ”تو کیا تم دوبارہ چلنا نہیں پسند کرتیں؟“

زاہدہ:- ”اگر تم کہو گے تو سراسر آنکھوں سے تعمیل کروں گی۔“

اس واقعہ کو ہمینہ بھر سے زیادہ ہو گیا۔ ایک سال بعد احسان بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ رات کے شاید آٹھ بجے ہوں گے کہ ہمسائی کی لڑکی نے آکر کہا:-

”ااں یک پان کا کلڑا مانگ رہی ہیں۔“ آج سبیاں احسان کو اپنا پُرانا حکم یاد

آگیا اور بیوی سے پوچھا ”ابھی تک تمہارا یہ نحو سلسلہ برابر جاری ہے؟“

زاہدہ - "کس قسم کا سلسلہ؟"

احسان - "وہی روٹی پکانے کا۔"

زاہدہ - "تمہارے منع کرنے کے بعد کیوں کر ممکن تھا۔ میں نے اسی روز سے

وہاں جانا بند کر دیا۔ اب وہ اپنا آٹا بھیج دیتی ہیں۔ میں یہیں پکا دیتی ہوں۔"

احسان - "مگر میں تو منع کر چکا تھا؟"

زاہدہ - "تم نے جس بات کو منع کیا تھا اس کی تعمیل ہو گئی۔ گو حکم تم نے

کچھ نہیں دیا مگر تمہارے اس فقرے سے کہ ان کو اتنی فرصت کہاں میں یہ سمجھ گئی تھی

کہ تمہاری مرضی نہیں۔ اس لئے میں نے جانا آنا بند کر دیا۔ اگر مجھے یہ معلوم ہو جانا کہ تمہارا

یہ منشا ہے تو میں یہ بھی ختم کر دیتی۔"

احسان - "تمہارے بیان سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ تم اتنا تو سمجھ گئی

تھیں کہ مجھے یہ سلسلہ پسند نہیں۔ تم کو ان کی خدمت میں کیا مصلحت دکھائی دی۔"

زاہدہ - "آئندہ یہ بھی نہ کروں گی۔"

احسان - "اب تک جو کیا؟"

زاہدہ - "غلطی ہوئی۔"

## چودہواں باب

مسٹر حسن کی ذاتی آمدنی تو کچھ بھی نہیں، جو کچھ اگلے تلتے تھے وہ باپ کی کمائی

اور جائیداد کے برتنے پر۔ بیوی پہلے تو میاں کو بیکرا لگ کر دے، اس کے بعد فرض شریع

ہوا۔ اور نفرت یہاں تک پہنچی کہ جو کچھ گھنا پاتا پاس تھا وہ اصل اور سود میں فنا ہوا۔ بیٹے

اور ہوکا یہ انجام دیکھ کر باپ اور ماں دونوں رنجیدہ ہوئے۔ باپ کی یہ خفگی اگر حسن کا

اپنی قوت بازو کا روپیہ ہوتا تو شاید میاں بیوی کی نگاہ میں زیادہ وقعت نہ رکھتی۔ مگر اس موقعیت



یہ آئی کہ خفگی فقط خفگی ہی تک محدود نہ رہی۔ بلکہ عمل میں بھی آگئی اور دونوں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ خود ہیوں نے مفلس قرضواہوں کا ہوا اتفاقاً اچھٹکے چھوٹ گئے۔ اب بیوی کے سامنے میاں اور میاں کے سامنے بیوی تھیں۔ وہ اس کو گنہگار سمجھتا اور یہ اس کو۔ حسن پر یہ حیبت پہاڑ کی طرح گری اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ اس نفیر کا سبب اس انقلاب کی وجہ اس بربادی کا باعث بیوی اور صرف بیوی ہو۔ ماباپ اس کی بدولت چھوٹے قرض اس کے طفیل ہوا، اتفاقاً اس کے کارن ہوئے یہ مانا کہ ترقی یافتہ انسان تھا۔ مگر کھانا انسان۔۔۔ محسوس کیا جو پڑی اور سمجھا جو آئی۔ بیوی سے پارہ نرمی سے اور استغنی سے کہا بھی اور بتایا بھی کہ اب پہنچن بٹھنے والے اور یہ ڈھنگ ٹیکے دیے ہیں۔ ہاتھ روکو اور دل مارو۔ قرضواہوں نے ناک میں دم کر رکھا ہے ایک ڈاکٹر کا خرچ وہ کر سیکھے لگی ہے کسی طرح ختم ہی نہیں ہوتی صحت اگر اس قدر روپیہ خرچ کرنے سے میسر آتی ہو تو میری رائے بر قدرت سے زیادہ ظالم کوئی طاقت نہیں "مگر بڑھا ہوا دل، پڑا ہوا لپکا، بیوی کی سمجھ میں آتی کیا خاک اور ستا کون کجنت۔ حالت روز بروز رومی اور معاملہ ساعت بہ ساعت خراب ہوتا گیا اور دن بھی آپہنچے کہ قرضواہوں کا نار صبح سے جو شروع ہوا تو شام تک نہ ٹوٹا۔ واقعات کی اطلاع ماباپ دونوں کو ہو رہی تھی انہوں نے حسن کو بار بار متوجہ کیا اور مدد متوجہ ہوا۔ مگر شاہکار کو متوجہ کرنے والا کون تھا یا ہوتا۔ انوار اس بل تھی ہی نہیں۔ اگر کوئی تھا تو اسے دے کہ ایک باپ جو کچھ بھی سکھاتا اور کچھ بھی سکھاتا تھا۔ اور شروع شروع میں دو ایک دفعہ کہا بھی۔ مگر دیکھا یہ کہ اس اللہ کی بندگی نے اس کا سننا اور اس کا انکار دیا تبیل تو درکنار بحث پر تیار اور بگڑنے پر آمادہ ہو گئی تو گھٹتی سا دھلی۔ اور سمجھ لیا کہ جیسا کریگی ویسا بھرے گی۔

وقت تنہا کی بات ہے ان ہی دنوں میں خاتماں کو تنفس کا دورہ ہونا تھا۔ مگر بڑھا آدمی پرانی آنکھیں دیکھا ہوا آنا اور شتم شتم پکارتا رہا۔ جب بخار آنے لگا تو مجبوراً آنا

چھوڑا۔ اسباب پکانے والا کوئی نہ تھا ایکس وقت تو یوں کٹا کہ بہرے اندر چلی نے بل بل کر کچھ کر دیا گر وہ کھانا ایک فقط نام کھاتے کا تھا گوشت ہے وہ جلا ہوا۔ شور با ہے وہ ہساندا رہے جادہ وہ گاتھی بھی اور کچے بھی۔ شاہد کا نے کسی جگہ نہ لکھے۔ دو ایک سے باقی بھی کہا۔ مگر بازار کی ترکاری یا گلی کا سودا نہ تھا کہ دام بھیجے اور منگوایا۔ دوسرے وقت شاہد کو خود پکانا پڑا۔ یہ پہلا دن اور پہلا موقع تھا جہاں شاہد کی حیثیت کے تین تین سنڈیلز کا مصالحہ پیسے۔ بہرے کو دیا تو مرچیں ہلا ہلی اور چلی سو کھانا رنگ زہر خود پیسے بیٹھیں مگر جس کا کام اس کو سہاوے کہنیوں تک مرچیں لگ گئیں اور پھر بھی کھانا ڈھنگ کا نہ جڑا متواتر چار پانچ وقت یہی مصیبت ہی۔ شاہد کا سمجھ رہی ہو کہ میں نے میاں کو مول لے لیا اور احسان کیا کہ عمر بھر کان نہ ہلا سکے۔ دونوں وقت اس گرمی میں کہ آگ کی طرف دیکھا نہ جائے کھانا پکا رہی ہوں مگر حسن خیال کر رہا ہے کہ ایسی عورت بھی کس کام کی جسکو کھانا تک پکانا آتا ہو۔ شاہد علی ہوئی حسن بھلا ہوا۔ دینیں غبار دونوں کے۔ وقت کی دیر اور موقع کی ضرورت تھی کیفیت اس وقت دونوں کی یہ تھی کہ چھوڑا پکا پکا یا تھا۔ شتر دیا اور پھٹا۔ شاید پانچواں روز تھا کہ حسن کھانا کھانے بیٹھا۔ شور بے کا پہلا ہی چھچھو لیا تو جھکنا نہ سہیچہ اور شور دیا دونوں چھوڑا۔ چا دلوں پر جھکا تو پچھچھ۔ کہا بکو جھکا تو پچھچھا۔ کہنے لگا۔

”یہ پانچ روز سے متواتر فاقے پڑ رہے ہیں اگر یا درچی بیمار پڑ گیا تو اب بھوکا ہی مرنے۔“

**شمارہ۔** ”بادرچی کی بیماری کی جس قدر میں ذمہ دار ہوں اسی قدر تم۔ پھوٹے

اگر تم یہ تو میں بھی ہوں۔ افسوس ہے تمہاری طبیعت پر اور جس سے زیادہ تمہاری قدرانی ہے کہ آج یا پھر روز سے میں خود کشت سے سخت مصیبت اٹھ کر محض تمہارے واسطے چرتے

سے آگے مری ہوں۔ بجائے اس کے کہ تم شکر کرتے اور ناشی شکایت کرتے ہو۔“

**حسن۔** ”تم کیسی خوب باتیں کیا کرتی ہو یہ تمہارا فرض ہے کسی پر احسان نہیں میں تمہاری خدمتیں پوری کرتا ہوں۔ یہ وہ تمہارے ہاتھ میں دیتا ہوں کیا تم پر احسان؟“

اسی طرح اگر تم کھانے کا انتظام کرو۔ یا خود پکاؤ۔ یہ تمہارا فرض ہو اور ہونا چاہیے۔“  
**شاہدہ**۔ ”تو کیا بیویاں اس لئے کی جاتی ہیں کہ وہ چوٹے میں ٹھکیں  
 اور بھاڑ میں بھنیں۔“

**حسن**۔ ”یہ میرا مطلب نہیں ہے۔ اگر کھانا پکانا یا پکوانا ایسی سخت مصیبت  
 ہے تو اس سے بہت زیادہ مصیبت کے کام مرد بھی کرتے ہیں۔ لیکن وہ یہ نہیں  
 سمجھتے کہ عورتوں پر احسان کر رہے ہیں۔“

**شاہدہ**۔ ”تمہاری گفتگو ایسی تیز ہے کہ افسوس میں برداشت  
 کے واسطے تیار نہیں۔“

**حسن**۔ ”تمہاری حالت اس قدر خراب ہے کہ مجھ میں اب سہارا کی ہمت  
 نہیں۔“

**شاہدہ**۔ ”اس کا فیصلہ یہ بہتر ہوگا کہ تم اپنے گھر خوش‘ میں اپنے۔“

**حسن**۔ ”اگر یہ ہی بہتر فیصلہ ہے تو سسر آنکھوں پر۔“

**شاہدہ**۔ ”خیر مجھے زیادہ بحث کی ضرورت نہ فرصت۔“

[ اتنا کہہ کر شاہدہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے کمرہ میں آ بیٹھی۔ سوچنے لگی کہ

چھ چھ مہینہ سے حسن کا مزاج آسمان پر ہے۔ میرا کہیں جانا اسے ناگوار کسی سے ملنا

اسے ناگوار۔ حد یہ ہے کہ میرا کپڑا میرا خرچ میرے لوکر چاکر کوئی بھی اسے گوارا نہیں۔ مجھے

معلوم ہے کہ وہ شہر سے گھر خدا نہیں۔ میں جانتی ہوں کہ میں بیوی ہوں مگر لونڈی نہیں۔

حسن نے اپنے دل میں سمجھا کیا میں اسے وہ مزاحیچھاؤں کہ عمر بھر یاد کرے۔ اس کا کیا

نصودر۔ قصور مسلمانوں کا ہو وہ بھی آخر مسلمان تھا۔ مسلمان نکلا۔ سنا اسے دیکھتا ہوں کہ عورت

لونڈی اور سہر بیوی باندی۔ جب ہم اپنی حالت درست نہ کریں اور مردوں کو نہ بتا دیں کہ ہم

بھی کچھ طاقت رکھتے ہیں تو شکایت فضول۔ اگر آج تمام مسلمان عورتیں یہ معاملہ کر لیں

اتنا کہ کر شاہد کے لئے کچھ سوچا اور یہ کہتی ہوئی اُنھنی "ضرور ضرور"۔

”ہم کو پانی کی ضرورت ہے“

بہتے تھانے لپکا اور قوراً پانی لے کر حاضر ہوا۔ شکریہ ادا ہوا۔ ایک آدھ بات بھی ہوئی۔

اور اب سلسلہ یہ شروع ہوا کہ جہاں گاڑی ٹھہرتی کسی نہ کسی بہانے کسی نہ کسی ضرورت سے آتا اور ایک آدھ بات پوچھ پچھا جاتا۔ شاہنشاہ کو اس سے پہلے میوں سے ملنے کا اتفاق تو بہت ہوا تھا۔ اور وہ ان کے خلق کی بہت مداح تھی۔ مگر آج صاحب کے اخلاق کی بھی داد دینی پڑی۔ جو ٹھینک یو ٹھینک یو میں ادا ہو رہی تھی۔

صاحب کو بھی احمد آباد تک گاڑی کے ساتھ جانا تھا۔ اور یہ معلوم کر کے کہ لشکار بھی وہیں جانا ہے۔ اور یہ بے وارٹی اپنی سہیلی مسٹر نصیر دوسف کے اہل جاتی ہے کہنے لگا۔ ”آپ تو میری بہن ہیں۔“ مسٹر نصیر میری حقیقی بہن ہیں۔ اب آپ کو تار دینے کی ضرورت نہیں۔ پروانہ کیجئے۔ میں حاضر ہوں۔“

اب شاہنشاہ کو پورا اطمینان ہو گیا۔ احمد آباد پنج ٹرین سے اتر گاڑی میں بیٹھا ایک مکان میں جا اتریں۔

شاہنشاہ۔ ”برادر! اس گھر میں عورتیں مطلق نہیں۔ مسٹر نصیر کہاں ہیں؟“  
 برادر۔ ”وہ ایک شادی میں گئی ہوئی ہیں۔ میں نے بلائے کو آج بھیجا یا ہے۔“  
 شاہنشاہ۔ ”اوہ! آپ کو بڑی تکلیف ہوئی۔ ٹھینک یو۔ ٹھینک یو۔ برادر ٹھینک یو۔“  
 برادر۔ ”نہیں نہیں مسٹر تکلیف کی کچھ بات نہیں۔“  
 شاہنشاہ۔ ”مگر اور کوئی بھی یہاں نہ رہا۔ سب چلے گئے۔“

برادر۔ ”حقیقی جھٹجے کی شادی ہے۔ وہ آجائیں تو پھر میں بھی جاؤں۔“  
 ڈوروز کی چھٹی میں نے بھی اسی واسطے لی ہے۔ آپ غسل کر لیجئے یہ سائے غسل خانہ ہے۔ میں باہر چلا جاتا ہوں۔“

برادر باہر آکر ٹہلنے لگے۔ دو تین گلاس پئے۔ شاہنشاہ اندر جا کر نہائیں۔ دو جوڑے سانچے تھے۔ کپڑے، برے بال درست کئے اور مسٹر نصیر کا انتظار کرنے لگیں۔  
 انوسر گاڑو! کیسا ہی ہتھیار ہو۔ مگر شاہنشاہ بھی زیادہ بیوقوف عورت نہ تھی۔

آٹھ بجے گاڑی سے اُتری۔ جب رات کے گیارہ بج گئے اور اُس نے دیکھا کہ غولس کا پنہ نہیں۔ اور یہ کہ تختہ پیٹا پکڑے پکڑے پھر رہا ہے۔ تو اٹھا ٹھنکا۔ کچھ دیر ٹہلی اور سوچا۔ گھڑی دیکھی تو بارہ بجنے والے تھے۔ اب اٹھا لکھنا لیکر آیا تو سب بازار کا منہ نہ تو پہنچا ہی ہو چکا تھا۔ کھانے کے شبہ کو یقین بنا دیا۔ اُن کی کسی ضرورت سے باہر گیا دو تین گلاس اور ڈائے۔ شاہد کا نے یہ موقع نہایت سمجھا اور جھٹا دروازہ بند کر کنڈی لگالی۔ افسر "رنگ دیکھ کر بہت سٹ پٹایا۔ منت کی، حاجت کی ڈورایا دھمکایا۔ اور جب کچھ بس نہ چلا تو کہنے لگا "لیجئے وہ آگئیں۔"

"آگئیں دروازہ کھولئے۔"

شاہدہ۔ "ان کو دروازے تک آنے دیجئے۔"

انور۔ "آپ دروازہ تو کھولئے۔"

شاہدہ۔ "ان کو آنے تو دیجئے۔"

کوئی گھنٹہ بھر تک یہ بحث ہوتی رہی۔ جب افسر بالکل ہی نامید ہوا تو دبا کر دو گلاس اور پئے اور کوشے پر پڑھ کر چھوٹی ڈچھت پر آدم سے نیچے۔ اب شاہدہ کا تھر تھر کانپ رہی تھی۔ جس قدر منت پہلے افسر نے کی اتنی بلکہ اس سے ڈگنی شاہدہ کا نے کی۔ مگر جس طرح وہ بے سود ہو گئی۔ اسی طرح یہ بیکار۔ افسر شراب کے نشہ میں پُور تھا۔ آگے بڑھا۔ چلا نا چاہتی تھی کہ ظالم نے سوتے بچے کو گردن سے پکڑ کر اٹھا لیا۔ روتی دھڑا دھڑا ہو رہی تھی۔ دیکھتی ہے تو تیز جا تو افسر کے ہاتھ میں موجود ہے۔ کچھ بے خبر ڈا سوتا تھا۔ اس ناگہانی مصیبت سے آنکھ کھل گئی تو ظالم کے پنہ میں ترپ رہا تھا!

انور۔ "اگر تیرے دل میں رحم نہیں ہے تو میں اپنی جان پر کھیلتا ہوں۔ مگر سب سے پہلے تیری آنکھوں کے سامنے تیرے کلیجے کے ٹکڑے کو بکری کی طرح ذبح کر دوں گا۔ یہ

صحن اسن صوم کے خون سے اور تیرے پکڑے اس سے لال ہوتے ہیں۔"

بچہ نے حسرت بھری نظروں سے ماکو دیکھا۔ گرفت نشہ کی تھی۔ غصہ کی تھی۔ سخت تھی۔ مصدوم آنکھیں نکلی پڑتی تھیں۔ مگر آواز نہ نکلتی تھی۔ یہ بس تھا، مجبور تھا، لاچار تھا۔ نیم ترقی یافتہ ماں کے سوا صرف نیم کی پتیاں اور آسمان کے تارے اس کی ناک منظر کو دیکھ رہے تھے۔ عجب وقت اور نازک حالت تھی۔ جانتی تھی کہ منقریب یہ پھول اس جفا کار کے ہاتھوں پا مال ہوگا۔ انسان کی ماری بلبلائی تھی۔ گڑ گڑاتی تھی، تڑپتی تھی، روتی تھی، یہاں تک کہ چاقو کی دھار مصدوم کیلچہ کے پاس چکی اور اس چمک نے نصیب ماکو فریسی برادر کے قدموں میں گرادیا۔ روتی، اور رو کر کہا ”بھہ پر ہم کر، یہ تین بچوں میں کیا بچا ہے۔ دو گنہگار یہ صورت اتنی دیکھی ہے۔ میں وہ بد نصیب ہوں جو اپنے ہاتھوں وہ نقد پھوٹی ہوں جو اپنی عقل سے اس آنکھوں کے تارے کو پھولوں کی بیج سے اٹھا کر اس قتل میں لائی۔ اور اپنی نادانی کی بدولت اس بیگناہ ہستی کو تیرے قبضہ میں دیدیا۔ دیکھ اظالم اس بچہ کو دیکھ ابہر رہا ہے، چھوڑ دے، لٹہ میرے بچے کی گردن آزاد کر دے۔ یہ بیگناہ مصدوم دھل رہا ہے۔ اس کا دم نکل جا بیگا۔ اس کا گلا گھٹ رہا ہے۔ اسکی جان نسا ہو جائیگی۔“

الور۔ ”مگر میری حالت اس سے بدتر ہے۔ تڑپ رہا ہوں، مر رہا ہوں۔ تیرے قدموں میں سر ہے۔ تیرے ہاتھوں میں زندگی ہے۔ رحم کر میں اس سے بہت زیادہ رحم کا مستحق ہوں۔“

شہابہ۔ ”چھوڑ دے۔ اودغا باز چھوڑ دے۔ اور مکار چھوڑ دے۔ دیکھ اسکی آنکھیں نکل پڑیں۔“

الور۔ ”کبھی نہیں، ہرگز نہیں تو کتر ہے، تو پتھر ہے۔ تو اس سے زیادہ سزا کی مستوجب ہے۔ دیکھ کیا ہوتا ہے اور کیا ہوگا اگر یہ واقف تیرا بچہ ہے، اور تو اس کو بچانا چاہتی ہے۔ تو یہ گھر اور اس گھر کا مالک دونوں تیرے غلام ہیں تو یہاں وہ آرام کر۔ حکومت کر، خوش رہ، اور خوش رہنے دے۔“

**نشاہدہ۔** ”تو اس بد نصیب پر اور اس بیوقوف پر جو محض اپنے نیبے میں گھرتا  
مکمل کھڑی ہوئی رحم کرا س کچھ پر جس کا باپ موجود۔ اس عورت پر جس کا شوہر زندہ اس پر  
جو شریف کا بچہ اس پر جو تیس کی بیوی ہے۔ رحم اور اپنی شرافت سے مجھ کو وہ وقت نہ  
دکھا کہ میں دنیا سے نامراد رخصت ہو جاؤں۔ میں اب بھی اگر ایمان کوئی چیز ہے تو عزیزوں کو  
منہ دکھانے کے قابل نہیں ہوں۔ میرا بچہ نکل رہا ہے۔ میرا سر تیرے قدموں میں ہے  
اپنے قصد سے باز آ اور اس بچہ کو چھوڑ دے۔“

رات کا پچھلا پہر تھا۔ خلق خدا نیند کے مزے لے رہی تھی۔ مغرب کی اندھا  
یوہندہ تغلیب کرنے والی نیم یافتہ لڑکی کی آواز نہ ہوا میں گوبھی۔ اس کے پاس اس کے سوا  
کیا تھا کہ پڑوسیوں کی در دے۔ چیتا شروع کیا۔ لوگ دوڑ پڑے، دروازہ بند تھا  
توڑا اندر گھسے دیکھا افور نشہ میں چور عورت حیران، بچہ بے ہوش، حال پوچھا۔  
افسوس کیا اور معاملہ پولیس کے سپرد ہوا اور افور کو سزا ہوئی۔  
فیصلہ کا ایک حصہ جو جج نے لکھا یہ تھا:۔

”عورت کی داستان نہایت درد انگیز ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ ترقی  
کی دھن اور تعلیم کے شوق نے اس کو یہ دن دکھایا مگر ایسا کہنا تعلیم پر  
زبردست حملہ ہو گا۔ مسلمانوں میں تعلیم نسواں کا حکم صاف ہے اور  
ان کے ہاں ایسی ایسی عورتیں گزری ہیں جن کے سامنے جید سے جید  
عالموں کی گردنیں ہمیشہ جھکیں مسلمان قوم ان بایہ ناز خواتین کی ہستی سے  
برپز ہے جن کے نام بساط علم پر آفتاب و اہتاب کی طرح چمکے اور ان کے  
جب وقت نے ان کی حکومت کا پاسہ پٹا اور حاکم سے محکوم، بادشاہ  
سے رعیت، اور امیر سے فقیر ہو گئے اس وقت ان کے پاس صرف  
ایک چیز رہ گئی۔ جو عورت کی عصمت تھی۔ اب ان کی تمام توجہ اس طرف



مبذول ہوئی۔ قانون ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اور وہ سرائیں جو اسلام نے ان جرائم کے واسطے مقرر کی تھیں۔ ان کی دسترس سے باہر تھیں۔ اس لئے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ وہ پردہ کو سخت کریں۔ اور اس طرح خواتین کو ایسے مواقع میسر نہ ہونے دیں جو اس قسم کے جرائم کے محرک ہو سکیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس طرح انہوں نے عورت کو اس آزادی سے کچھ نہ کچھ محروم کر دیا جو اسلام نے اس کو عطا کی تھی۔ مگر اس کا معاوضہ انہوں نے دوسری صورت میں کیا۔ اور اس کا اعزاز و احترام اور اعتبار سے بڑھا کر اس کی کمی کی تلافی کر دی۔ کچھ دوسری قوموں کے میل جول کا اثر تھا کچھ وقت کا مطالبہ۔ اب مسلمانوں میں ایک فریق ایسا پیدا ہوا جس نے اس تجویز کو غلطی پر عمل کیا اور سمجھا کہ ہماری عورتیں جاہل ہیں۔ ان کو پڑھا لکھا کر دینی حق دینے چاہئیں جو عطیہ اسلام ہیں۔ اس مقصد کے واسطے انجمنیں قائم ہیں۔ اور اخبار کام کر رہے ہیں۔ مگر اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ اعدول مذہب اس فریق کے پاس سے رخصت ہوا اور اس زبردست قربانی کے بعد بھی ان کو جو کچھ میسر آچکا وہ صرف اتنا کہ اردو کی دھپاڑائی سیارہی سطرلاب لکھ سکیں۔ اسی کوشش کا نتیجہ یہ بد نصیب ماں شاہدہ بھی ہے۔

## پندرہواں باب

ایسی ناہنجار لڑکی خدا دشمن کو بھی نہ دے۔ سچ پوچھو تو کنہہ اور برادری کیا تمام دنیا میں ناک کٹ گئی۔ ایسا واقعہ میں نے تو کبھی عمر بھر سنا نہیں جو خدا نے اپنی آنکھ

از علامہ راشد الجیری

سے دکھایا۔ میرا بس چلتا تو اس فنا ہوا کا نام کو نصیر آباد ہی میں دفن کر دینا۔ یہ تمام نتیجہ تہاری غفلت کا ہے کہ تم اس سے ہمیشہ الگ رہیں اور ان کجحت نرسوں رسوں نے اپنے رنگ پر ڈھال دیا۔

**بیوی۔** ”اگر تمہاری یہ رائے ہے تو بیچ ہوگی۔ میں اس کا کیا جواب دوں۔ جس روز سے سنا ہے جو کچھ دل پر گزری ہے۔ میں ہی جانتی ہوں۔ دنیا آنکھوں میں اندھیر ہے۔ حرام موت نہ ہوتی تو میں تو کچھ کھا کر سو رہتی۔“

**میاں۔** ”غضب یہ ہے کہ اب بھی کجحت کی آنکھ میں ٹیل اور تیوری پر ریل نہیں۔ وہی کٹا، اور وہی زبان۔ اگر تعلیم کا انجام یہ ہے تو یقیناً تعلیم حرام۔“

**بیوی۔** ”تعلیم کا نتیجہ ہرگز یہ نہیں ہو سکتا۔ یوں کہو کہ طریقہ تعلیم متحسن نہیں۔ جس طرح تعلیم دینی چاہیے اس طرح نہیں ملتی۔ اور جو ڈھنگ زہریلے ہیں انہیں سے کام لیا جا رہا ہے نتیجہ تو یہ ہونا ہی ہے۔“

**میاں۔** ”یہ تمہاری شاگردیں کجحت اس قدر چلاتی ہیں کہ بات کرنی بھی تو مشکل ہو۔ ذرا ان کو خاموش کرو۔ کان کے پردے پھٹے جاتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ اس میں کیا مصلحت ہے کیا تم کو استانی گری کی روٹی کھانی ہے جو یہ اتنی ساری پال رکھی ہیں۔ پرٹھانے لکھانے کا نتیجہ آنکھ سے دیکھ لیا، کان سے سن لیا۔ اب تو یہ سلسلہ ختم کرو۔ تمہارے یہاں یہ خاندانی مرض ہے۔“

**بیوی۔** ”یہاں تک نوبت پہنچ گئی اوساب تک تم معاملہ کی تہ کو نہ پہنچے۔ اس تعلیم کا نتیجہ خراب نہیں ہو سکتا۔ یہ اسلام کا عین منشا اور ہماری ضرورتوں کے قطعی مطابق ہے۔ لڑکیوں کو میں بھی خاموش کر دیتی ہوں۔ مگر اس طریقہ کو قابل اعتراض سمجھنا غلطی ہے۔ مبارک ہے وہ گھر جہاں خدا کے مقدس الفاظ کا نور میں آئیں اور عاجز بندے اس پر دست طاعت سے سلسلے عجز کی زبان کھولیں۔ یہ تعلیم ان کی دنیا اور دین دونوں

کی فلاح کا باعث ہے۔ خرابی آن کر یہ پڑی ہے کہ تمہارا وہ فریق جو تعلیم جدید کا دلدادہ ہے اصلیت پر غور نہیں کرتا۔ تم جس بہتر سے بہتر ادا علی سے اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی کو چاہو لا کر ان سے مقابلہ کر لو تم کو معلوم ہو جائیگا کہ تعلیم نسواں جائز بلکہ ضروری اشد ضروری مگر طریقہ تعلیم یہ متحسن اوردہ مکروہ۔“

بیوی کی گفتگو ابھی پوری طرح ختم نہ ہوئی تھی کہ ایک لڑکی سامنے آئی اور کہا کہ ظہر کی اذان ہو رہی ہے۔“

**بیوی۔** ”تم نے دیکھا اس کی عمر مشکل سے سات برس کی ہوگی مگر اس کے دل میں نماز کا شوق اس قدر کیونکر پیدا ہوا۔ اصل میں نماز کے بعد میں ان کے سامنے کہانی کے طور پر کچھ گزشتہ واقعات برسی پورٹھیوں کے جو میں نے دیکھے اور سنے بیان کیا کرتی ہوں۔ اس وقت تو یہ کہانیاں ان سے نماز پڑھواتی ہیں۔ مگر مجھے یقین ہے کہ یہ عادت ان کی طبیعت میں رفتہ رفتہ اس قدر پکٹی ہو جائے گی کہ خواہ دنیا کی کوئی چیز بہتر سے بہتر ان سے چھوٹ جائے۔ مگر نماز نہ چھوٹے گی۔ اگر تم کو فرصت ہو تو آج اس چھوٹے سے مکتب کا بھی نمازنا دیکھو۔“

لڑکیوں نے جیسا چھپ وضو کئے۔ قرآن شریف جزاں کر الماری میں رکھے۔ تختیاں کونڈ میں کھڑی کیں۔ اور کہا استانی صاحب بی بی فخر کا حال آگے فرمائیے۔“

**استانی۔** ”ہاں تو سٹیو! خدا کا کرنا کیا ہوتا ہے۔ جب ان کے میاں کی آنکھوں میں پانی اتر آیا اور چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو گئے تو نوکری جاتی رہی۔ دن بھر گھر میں سرمہ اونڈھائے اٹوائی کھٹوائی لئے پڑے رہتے۔ مرو کی عزت کمائی سو ہے۔“

جیب اس قابل نہ رہے تو وہ غصہ غنیمتہ سب جتا رہا۔ بچے سر پر جھینٹے اور بچا رہے اُف نہ کرتے۔ یاد وہ بنا دھا بندھی کہ اوہرا نہیں نے گھر میں قدم رکھا اور اوہر بیوی ہل بچوں کے منہ سل گئے۔ یکس کی اتنی مجال تھی کہ سانس بھی دُور سے لے لیتا معلوم ہوتا تھا

نادر شاہ بیٹھے ہیں۔ یا اب یہ کیفیت ہوئی کہ لڑکے اور لڑکیاں سر پر ڈھنڈورہ پیٹ رہی ہیں۔ اور وہ پڑے سُن رہے ہیں۔ ساتھ روپے ہیندہ کے نوکر رہے اور اوپر کی بھی تھوڑی بہت آمدنی تھی۔ مگر ایسے فضول خرچ اور اتنے بے ڈھنگے کہ کبھی وقت بے وقت کے واسطے کچھ رکھا ہی نہیں۔ ایک یہ مرض تو بارہ مہینے کا تھا کہ کبھی گھر میں خالی ہاتھ نہ گئے۔ فصل کی ترکاری اور موسم کا میوہ رومال میں ضرور ہوتا تھا۔ رات کا دودھ کبھی مانگہ نہیں ہوا۔ وہ بھی یہ نہیں کہ گھر میں دُش دن کے چھ پیسے رومال میں باندھ سیدھے علوانی کی دکان پر۔ دو چار یا دوست اور ہیں ادھر ادھر کی باتیں کر رہے ہیں۔ اور سڑک پر کھڑے دودھ اڑا رہے ہیں۔ پی چکے تو سب اپنا اپنا کلہاڑا پھینکا جس کی آواز دور کی ہوئی وہ ہی اپنے فن کا اُستاد مختصر یہ کہ اتنی پچاس روپیوں میں بیوی فوس کے پلے کوئی پچاس روپے پڑتے ہونگے۔ پانچ بچے دو میاں بیوی ایک بڑھیا ماما آٹھ دم تھے۔ لاکھ سستا سماں اور بھلے دن تھے۔ مگر کپڑا لٹا کھانا پینا بیعتے دم کے ہزار خرچ تھے۔ بچاری جس طرح ہوتا شتم شتم گزر کرتی ہاں موقعہ جب ملتا۔ رنج دیکھتیں یہ ہیشہ کہتیں کہ خدا کی واسطے کچا سا تھو ہے۔ دوا لڑکیاں آگے ہیں اس کھانے پینے کو کون دیکھتا ہے۔ کچھ تو آگے کی بھی سوچ کر دے۔ مگر وہ اللہ کے بندے تو ایسے کانوں میں روئی تھوڑ کر بیٹھے کہ کبھی دھیان ہی نہ کیا۔ نوکر سی گئی تو کل تیرہ روز کی تنخواہ چڑھی ہوئی تھی۔ وہ کے دن کی۔ اب پانی اُترا تو انھیں کھل گئیں۔ بیوی سے کچھ بولنے تو کس منہ سے اور بچوں سے کہتے تو کس برتے پر۔ چھکے پڑے رویا کرتے۔ ساری رات جاگتے اور اپنی غلطی پر پچھتاتے۔ میں تم سے کہہ چکی ہوں کہ بیوی کے جینک میاں نوکر چاکر ہے اکثر ان سے ناخوش رہیں اور ان کے ان ڈھنگوں کو کبھی نہیں پسند نہ کیا مگر میاں کا اندھا ہونا تھا کہ وہ پاؤں کی خاک ہو گئیں۔ کیا کوئی لونڈی یا ماما خدمت کرے گی جو انہوں نے کی۔ بیوی کی یہ اطاعت دیکھ کر میاں کا کلیجہ منہ کو اتار۔ صبح کی

نہایت کا سلام پھیر دیا پیسے بیٹھ جاتیں اور میاں نے آنکھ کھولی دوسرا ہوں نے  
گلی کو پانی دیا۔ اور دوائی پلائی۔ جاڑوں کے دن تھے۔ اپنے ہاتھ سے دھو پیس لیا کر  
بٹھاتیں اور اپنے ہاتھ سے اندر لیکر آئیں۔ اس اوقات نے میاں کے دل میں ایسا گھبراہٹ  
کہ وہ ان کے پاؤں چومتے اور کہتے کہ جنت کی حوریں بھی تم سے بہتر نہ ہوں گی ایک روز کا  
ذکر ہے تہجد کی نماز پڑھ کر اٹھیں کہ میاں نے کروٹ لی۔ کہنے لگیں:۔  
”کیا جاگ رہے ہو کچھ کام ہے؟“

میاں:۔ ”کیا خاک جاگ رہا ہوں تقدیر کو رو رہا ہوں۔ بھٹوڑا سا پانی پلا دو۔“  
بیوی:۔ ”کیوں رونے کی کیا بات ہے خدا کا شکر کرو کہ عزت آبرو سے گھر  
میں بیٹھے ہیں۔ لو پانی پیو۔“

میاں:۔ ”میری حالت اب یہ ہو گئی ہے۔ کہ تم سے کوئی کام لینے ہوئے  
بھی مجھے شرم آتی ہے۔ دن رات اسی فکر میں رہتا ہوں کہ کیا کروں۔ ایک پیسہ کی آمدنی  
بہرہی۔ شاہنشاہ سے تم کو اس طرح گزار رہی ہو۔“

بیوی:۔ ”تم کس قسم کی باتیں کیا کر رہے ہو۔ نہیں شرم کس بات کی؟ میں ہوں  
کس واسطے؟ جو کچھ کر رہی ہوں یہ میرا فرض ہے۔ روپیے کی طرف سے تم زیادہ فکر  
نہ کرو میں ہمیشہ یہ کیا کرتی تھی کہ جو روپیہ تم میرے ہاتھ میں دیتے تھے فی روپیہ ایک آٹا  
الگ کر دیتی تھی۔ ایک پیسہ اللہ کے نام اور تین پیسے محفوظ۔ جب یہ وہ پیسے روپیہ ہوتے  
تو پیسے دیکر روپیہ بنوا لیتی تھی اور ڈال دیتی تھی۔ اب جو میں نے دیکھا تو خوار نے  
یہ برکت دی کہ سات سو روپیہ ہو گئے۔ بھئی والے سینٹھوں کی بیوی پرسوں کہہ رہی تھیں  
کہ تم وہ روپیہ دیدو میں بچ میں ڈال دیتی ہوں میں روپیے مہینہ کے مہینہ لئے جانا اب اگر  
تمہاری اجازت ہو تو دیدوں نہیں تو یہ روپیہ حاضر ہیں جو تمہاری صلاح ہو وہ کر دو۔“  
میاں:۔ ”میرا تو منہ نہیں جو تمہاری تعریف کروں خدا تم جیسی بیویاں دنیا کو دے

بہی والا سیٹھ نہایت ایمان دار آدمی ہے۔ تم فوراً روپیہ دیدو۔ بلا سے ہم کو تو روپیے میں اشرافیاں ہو جائیں۔“

پیارے بچو! یہ بیوی نوں کا سلیقہ تھا کہ اسی میں روپے میں انہوں نے گھر کا خرچ بھی چلا پایا۔ ایکسا بیٹی تھی بیابھی اور دنیا کے سب کام کاج کئے۔ لاکھ روپے کی بات جو انہوں نے کی وہ یہ تھی کہ اس مغلی میں گھر کی ہوانہ بگڑنے دی۔“

## سوٹھوال باب

کچھ وقت کا مطالبہ تھا کچھ پہاڑ کی آب دہوا کا اثر زاہد کا شوہر چراغ پا تو بیوی چلا تھا۔ اب صحبت بھی ان لوگوں کی ملی جو دن رات فیشن کا کلمہ پڑھ رہے تھے۔ آمدنی مستعمل تھی۔ آنکھیں کچھ اور ڈھونڈنے لگیں۔ گھر گھر کی حالت۔ درمی۔ چاندنی برتن بھانڈا سب چیزیں زیرِ نقض حد یہ ہے کہ گھر کے ساتھ گھر والی بھی آنکھوں کو ناگوار ہوئی اور جی چاہا کہ گھر بدلے اور ساتھ ہی گھر والی کی بھی تبدیلی ہو خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن کو تعلیم یافتہ بیویاں میسر آتی ہیں۔ اور ج جانتی ہیں کہ زندگی کس طرح بسر کریں۔ ان کی ہر ادا، ان کی ہر کوشش، ان کا ہر فعل، ان کا ہر قول طبیعت کو خوش اور دل کو چوچل و مارغ کو ناز دہ اور شوہر کو باغ و بارخ کر دیتا ہے۔ کاش میری تقدیر میں ایسی بیوی ہوتی۔ اور میں بھی دنیا کا کوئی لطف اٹھا سکتا۔ آخر اسی بیوی کی بہن شاہنشاہ ہے میں نے صرف چوتھی واسے روز دیکھا تھا۔ عورت لعل، بہات چیت، کچھ اٹھا، گھٹا پاتا۔ بیج تو یہ کہ علم کی خوشبو اس کے ہر ذرہ سے ہلک رہی تھی۔ کیا خوش نصیب! اس کا شوہر جس کو ایسی بیوی ملی۔ ایک میں ہوں کہ سوا دنیا نوی خیالات اور چہانت کی گفتگو کے کوئی آواز ہی کان میں نہیں آتی۔ مگر مجھے فکر کس بات کا۔ روٹی کپڑا دے جائو ٹکا اور چین و سرکاج کرونگا۔ کیا وجہ ہے کہ تعلیم یافتہ ہو کر ایک جاہل عورت کے ساتھ اپنی زندگی بسر کروں۔

مجھ کو خدا کی اجازت خدا کے رسولؐ کی اجازت اشد ضرورت پھر نہ کرنے کا سبب ؟  
 لڑکیوں کی کیا کمی احسان کے اس خیال کا زبان تک آتا تھا کہ خود ہی لڑکیوں  
 کے درنا، بھٹی ہو گئے۔ اب یہ میاں کی عنایت سمجھو، انسانیت کہو، انصاف سے  
 تعبیر کرو جو چاہے کہو کہ انہوں نے بیوی کو بھی اطلاع دیدی اور اس طرح کہا:-  
 ”تم کو معلوم ہے کہ شریعہ اسلام نے مرد کو چار نکاحوں کی اجازت دی ہے۔  
 میں دیکھتا ہوں کہ تمہارے سابقہ میری زندگی بالکل برباد ہو رہی ہو۔ اور کوئی وجہ  
 نہیں معلوم ہوتی کہ اس طرح یہ زندگی غارت ہو۔ مجبوراً میں نے کوشش کی ہو کہ ایک  
 تعلیم یافتہ عورت سے عقد کر دوں۔ اور اس طرح کمی کو پورا کر لوں مگر میں تم کو  
 یقین دلانا ہوں کہ تمہارے شرعی حقوق نہ بھولوں گا۔“

**زاہدہ:-** ”بیشک تم کو شرع نے اجازت دی ہے۔ اور مجھ کو اس میں دخل  
 دینے کا حق نہیں۔ مگر میں اپنی محبت سے مجبور ہوں۔ اس کو آسانی سے برداشت  
 نہ کر سکتی گی۔ تم شوق سے نکاح کر لو۔ مگر میری رائے میں یہ مناسب ہو گا کہ تم مجھ کو  
 چند روز کے واسطے گھر پہنچا دو۔“

**احسان:-** ”نہیں یہ مناسب نہیں ہو۔ رفتہ رفتہ سب باتیں گوارا ہو جائیں گی  
 یہ خاطر جمع رکھو کہ تمہارے اعزاء و اکرام میں کسی قسم کا فرق نہ آئے گا۔“

**زاہدہ:-** ”یہ تو مجھے تمہاری عنایت سے امید ہے اور میں جانتی ہوں کہ تم  
 پر دین میں میری بے وقعتی نہ ہونے دو گے۔ لیکن اس وقت تو اگر تم مجھ کو پہنچا دو تو اچھا۔“  
**احسان:-** ”بعض مصلحتوں کی وجہ سے میں اس کو پسند نہیں کرتا۔“

**زاہدہ:-** ”اگر تمہاری رائے میں میرا یہاں کا قیام ضروری ہے تو خیر۔“  
 احسان شادابی کی دھن میں مست تھا۔ اس کا دل تو یہی چاہتا تھا کہ کسی بیوی  
 کے سامنے پرانی کو دور کر دے۔ مگر ایک جھجک تھی کہ عزیزانِ رب مسکرا کر نہ جائیں۔ اس وجہ سے

اس نے بیوی کا جانا مصلحت نہ سمجھا۔ اور یہی مناسب سمجھا کہ اس کو بیس فیڈ کر کے شادی میں کیا ہاتھی گھوڑے لگتے تھے۔ جگہ تجویز ہوئی، تارنچ ٹھہری۔ نکاح ہوا، اور نئی دہن گھر میں آدھکی۔

یوں تو اس واقعہ کا ہر کھڑا کھلا ہوا ظلم تھا۔ مگر وہ ظلم جس کی تلافی نامکن تھی یہ ہو کہ احسان نے بیوی کا تمام زیور نئی دہن کو چڑھا دیا۔ اندیشہ تھا کہ شاید میاں کی یہ حرکت زاہدہ کو پسند نہ ہو۔ مگر نیک کوک کی بیٹی تھی انکار کیسا اور تامل کس کا ہنسی خوشی آگے رکھ دیا۔

نئی دہن کی محبت اور دہن بھی مغربی طرز کی تعلیم یافتہ جس کے میاں احسان جو یاد اور آنکھیں متلاشی۔ جس قدر بھی ہوتی کم تھی۔ قدموں کے نیچے آنکھیں بچھا نا اسکی زبان سے کسی بات کے نکلنے کی دیر تھی تعمیل میں دیر نہ تھی۔ اب زاہدہ کی حیثیت صرف ایک ماما کی تھی۔ آٹھ آٹھ دن سر میں تیل ڈالنا گناہ تھا۔ البتہ تہائے کی عادت چونکہ بچپن کی تھی۔ اس لئے نہ تو روز لیتی تھی۔ نہ کراٹھی اور وہی میلے کپڑے پہن لے۔ احسان بیس روپیہ ماہوار بھی خرچ کرتا تو بھی زاہدہ جیسی ماما اس کو میسر نہ آتی۔ یہ وہ اچھی طرح سمجھتا تھا لڑکا نہ تھا، بچہ نہ تھا۔ اگر چھوٹا موٹا بھی زاہدہ سے بات کرتا ہوں تو نئی دہن سچ مچ مجھ سے بات نہ کریگی۔ مہینہ مہینہ بھر آکھ اٹھا کر نہ دیکھتا۔ کھانا جو نئی دہن نکال کر دیتی۔ اور کپڑا جو وہ اپنے ہاتھ سے بنا دیتی۔ سر آنکھوں پر رکھتی۔ چھ مہینے اسی طرح بسر لے۔ اور اب سردی زور سے چکنے لگی۔

صبح کے وقت ایک روز احسان اچھا بچھا تھا۔ ہاتھ منہ دھو کر سہ گیا۔ مگر چار بجے کے بجائے ایک ہی بجے آگیا۔ اور آیا اس طرح کہ بخار میں لوٹھ تھا۔ شام کو خفیف سی سینہ میں کسک معلوم ہوئی۔

دوسرے روز ڈاکٹر کو بلایا۔ اس نے نمونیا تجویز کیا۔ صبح کو حالت خراب اور



شام کو بستر اور چوتھے روز تو اتنی خراب تھی کہ بات تک ٹھیک نہ کر سکتا تھا۔ رات کو پھر ڈاکٹر آیا تو اس نے کہا "طاعون کا بھار معلوم ہوتا ہے۔" اب مغرب زدہ تعلیم یافتہ بی بی کا کیا کام تھا۔ مرض منہاری میں ٹھہر کر خود مرض میں کیوں گرفتار ہوئیں اسی ذلت برتے اوٹھ سیدھی ہوئیں۔

زاہرہ بچاری جاہل ٹھوٹا وہ مرض منہاری کو کیا سمجھتی۔ رات رات بھر میاں کی پابنتی نہ چھوڑی۔

ایک رات کا ذکر ہے کہ احسان بے خبر پڑا تھا۔ پچھلا پہر تھا۔ اور پردہ زمین کی خاموشی گھر کے کونے کونے سے ٹپک رہی تھی۔ "تارے جھللا جھللا کر بے ثباتی دنیا کے نعرے لگا رہے تھے۔ چاندنی پھسکی پڑ چکی تھی کہ زاہرہ کے تخیل نے اس کو ایک دوسری دنیا میں پہنچا دیا۔ اس کو شوہر کی موت کا یقین ہو گیا۔ اور وہ سوچنے لگی کہ دنیا کی تمام خوشی زندگی کا مدار اس دم سے تھا۔ اس کی جھڑکی غیر کی عنایت سے اور اس کا غصہ دوسرے کے پیار سے بہتر جب یہ نہیں تو کچھ نہیں۔ میری جنت ان قدموں میں اور میری دنیا اس صورت میں پوشیدہ ہے۔ میں بد نصیب تھی کہ جبکی خوشی پر راحت اور مخافت کا انحصار تھا۔ اس کو خوش نہ رکھ سکی۔ بعض دفعہ کیسی کیسی سخت باتیں اور کتنے کتنے بیڑھے جواب دیتی تھی۔ مگر خدائے مہربان اس کو راز کرے۔ سن کر چپ ہو جاتے تھے۔ اب یہ کہاں اور میں کہاں۔ میری زندگی برباد اور میری عاقبت تاراج ہوئی۔ میں نے کیا غضب کیا کہ قصور بھی تو معاف نہ کروالیا۔ اب دو گھنٹہ سے بات بھی نہیں کی۔ دو ایک نوکر پلاؤں تین بچے۔ آنکھ ہی ہیں کھولی۔ ہائے یہ سانس کیسا چل رہا ہے۔

زاہرہ گھبرا کر اٹھی آنکھ سے زار و قطار آنسو کی لڑیاں جاری تھیں۔ منہ

دیکھا اور بیباک کہہ کر باؤں پر گر پڑی :-

"مجھ کو منہاری کا قصور معاف کر دو"

آنکھیں تلوؤں سے مل رہی تھی۔ احسان کی آنکھ کھلی۔ بیوی کی محبت برجھی کی طرح کلیجہ میں گھسی اور ساتھ ہی نئی دہن کے چلے جانے کے خیال نے تمام حوصلے پست کر دیئے۔ زاہد کا اضطراب بجلی بن کر کلیجہ پر گرا۔ اس کا ہاتھ آنکھوں سے لگایا اور کہا:-  
”مجھ سے غلطی ہوئی۔ اگر زندہ رہا تو عمر بھر پاؤں دھو دھو کر پیوں گا۔“

ابھی احسان کا شکر یہ ختم نہ ہوا تھا کہ مؤذن کی صدائے توحید نے رات کی خاموشی کا سلسلہ توڑا۔ اٹھی وضو کیا۔ نماز پڑھی اور شوہر کی صحت کیواسطے گرو گڑا کر خدائے واحد کے حضور بس روئی۔ وقت نہیں ہو کہ یہ کہا جائے کہ نماز کی دعا قبول ہوئی۔ مختصر یہ کہ دوانے اتر کیا اور احسان کی حالت روز بروز سنبھلنے لگی۔

ٹوٹا باسن کسیرے کے سرجب تک احسان بیمار رہا زاہد کی ملکیت تھا۔ مگر تندرست ہوتا تھا کہ نئی دہن مع اپنے تمام حقوق کے گھر میں آتیں۔ زبردست کے بسوے بیس زاہد کا پھر وہی ماں تھی۔ اور نئی دہن گھر والی۔ احسان اگر ذرا بھڑکھڑ سے کام لیتا، اور غور کرتا تو واقعات آنکھ کے روبرو تھے۔ مگر بیعت ٹھوکر کھا کر بھی نہ سنبھلا۔ اب نئی دہن کو زاہد کی زندگی ایک کاشا تھا۔ جو ہر وقت دل میں ٹھک رہا تھا۔ لاکھ وہ دب چکی تھی اور اگر گھر سے اب اس کو واسطہ تھا تو صرف چوڑھے سے۔ مگر چاتر کی دور بلا۔ ہر وقت اور ہر موقع پر نئی ٹوٹی ایک نہ ایک بات ایسی جڑ دیتی کہ احسان آگ بگولا ہو جاتا۔ اور منہ میں جاتا سٹنا جاتا۔

ایک روز شام کے وقت احسان نے اپنے چند دوستوں کی دعوت کی۔ زاہد نے ہنسی ہنسی اور خوشی خوشی کھانا تیار کر دہن کے آگے لاکر رکھ دیا اور کونہ میں بیٹھ گئی۔  
دہن: ”ہاں باورچی خانہ میں جاؤ میرے سر پر کیوں چڑھ کر بیٹھ گئیں۔“  
زاہد: ”ہاں بیوی چلی جاتی ہوں۔ اس لئے بیٹھ گئی تھی کہ شاید بزن غمڑ کی ضرورت ہو تو دیدوں۔“

دلہن۔ "نہیں جس وقت ضرورت ہوگی میں خود بلا لوں گی۔"

یوں تو دن رات ہی زاہر کا دل پر ایک سے ایک زبردست چرکا لگتا تھا۔ مگر اس وقت کا کچھ کا ایسا بیٹھا کہ آنکھ میں آنسو آگئے۔ دس بارہ آدمیوں کا کھانا ایک اکیلی پکانے والی۔ دینے کی چوڑھی میں گھسی گھسی مغرب کے وقت نکلی۔ اور یہ انعام ملا۔ علیحدہ جاکر روئے لگی کہ احسان آیا اور کہا "کھانا باہر کون دے گا؟"

دلہن۔ "لاؤں یہاں سے دیدوں گی تم وہاں سے لے لینا۔"

احسان۔ "واہ تم کیوں دینے لگیں۔ زاہر کہاں ہے؟ بتاؤ۔ جواب

نہیں دیتیں۔"

دلہن۔ "کیا بتاؤں وہ ہمیشہ ناخوش رہتی ہیں۔ میرا جو کام تھا۔ میں نے کر لیا۔ کیا حرج ہے میں ادھر سے دیدوں گی تم ادھر سے لیں۔"

احسان۔ "زاہر! زاہر!!"

زاہرہ۔ "جی۔"

احسان۔ "کیا مصیبت ڈھارکھی ہے ہر وقت گدھے پر سوار۔"

زاہر کا نے احسان سے چھپانے کے واسطے دوپٹے سے آنسو منہ پھیر کر

پونچھے اور کہا "آپ جو فرمائیں حاضر ہوں۔"

احسان۔ "یہ کھانا ادھر سے کھڑے ہو کر دیدو۔"

زاہرہ۔ "اچھا۔"

نئی دلہن نے کھانا نکالا۔ زاہر کا نے اٹھا اٹھا کر باہر دیا۔ مگر نہ معلوم کیا زہر کھانے میں تھا کہ ایک ایک نوالہ کھا کر سنبے ہاتھ سکڑ لیا۔ چاولوں میں نمک دھیر سا لیں میں مرچیں ہلا ہل۔ اور تو اور غضب یہ کہ فیرنی میں برابر کی خاک اور کھانوں میں برابر کی راکھ۔ احسان کے ہوش جاتے رہے۔ دعوت، عداوت، اور فیانت مصیبت ہو گئی۔

بازار سے جو کچھ میسر ہوا لوان کے پیٹ بھر چلنا کیا۔ اور آپ آگ بجولا گھر میں آسار می داستانِ دلہن کو سنائی۔

**دلہن۔** ”میں تو اسی واسطے سارا کام اپنے ہاتھ سے کرتی ہوں کہ اپنا کام مہا کام۔ ہاں ان گجراتی کنگنوں میں یہ مار ہے کہ مرچیں اندر بیٹھ جاتی ہیں۔ اس لئے مہالکھ ان سے پسو لیا تھا۔ کیا خبر تھی کہ یہ آفت ڈھائے گی۔ ورنہ میں تو ان کو باورچی خانہ میں قدم بھی نہ دھرنے دیتی۔“

**احسان۔** ”یہ تو صورت دیکھ دیکھ کر جلی جاتی ہے۔ شریف تھوڑی سی ہے جو شرافت کے برتاؤ کو سمجھے۔ میں اس کمبخت کو غارت کر دیتا ہوں۔ اور اس کے منہ ہی کو آگ لگاتا ہوں۔“

بذصیب بیوی کی کیا مجال تھی کہ سفاک شوہر کے حکم میں دم مار سکتی۔ جب تک جاگتا رہا صلواتیں سناتا رہا۔ کتبہ بھر کو آگٹا۔ سات پشتوں کو پٹنا۔ جو جی میں آئی وہ شنائی۔ اور جو منہ میں آیا وہ بنایا۔ صبح اٹھا تو حکم دیا کہ آج تو غارت ہوگی اپنا اسباب و سبب باندھ لے۔“

زاہد کا آہوں کا پورا ذخیرہ شوہر کے پاس چھوڑ حسرتوں کا وزنی اسباب ساتھ لے پہاڑ سے چلی۔ گھر کو گھر کے کونہ کونہ کو آخری نظر سے دیکھا۔ محلہ اور محلہ کا بچہ بچہ اس کو دعاؤں کے ساتھ رخصت کر رہا تھا۔ رائی میں اس کی بلا میں لیتی تھیں۔ اور یتیم اس کے قدموں میں لوٹتے تھے۔ اس نے گاڑی میں بیٹھے وقت ایک اتجا بھری نظر شوہر کی صورت پر ڈالی۔ اور کہا:-

”خدا کے واسطے میرے تصویر مٹا کر دینا“

اگر ایمان پاس ہوتا، اگر عقل ساتھ دیتی تو مظلوم بیوی کی یہ اتجا ظالم کا کلیجہ توڑ دیتی۔ مگر دل سے نہیں دکھا دے کہ نہیں۔ فقط شوق پورا کرنے کو ہاتھ بڑھا کر

مصافحہ کیا تو کیا دیکھتا ہے کہ بد نصیب بخار میں مجلس رہی ہے۔ پوچھا کیا حال ہو؟

زاہدہ - "خدا کا شکر ہے۔"

احسان - "روئے کا سبب؟"

زاہدہ - "کچھ نہیں۔ ایک بات عرض کرتی ہوں۔"

احسان - "کیا ہے؟"

زاہدہ - "تمہاری تنخواہوں میں سے کچھ روپے میرے پاس بچے ہیں

یہ لے لو خدا نصیب کرے۔"

دونوں روپے کی ایک پوٹلی زاہدہ نے شوہر کے ہاتھ میں سی اور رو کر کہا:-

میری خطائیں معاف کر دینا۔"

احسان - "اچھا۔"

زاہدہ - "خدا حافظ۔"

زاہدہ کی گاڑی شکل سے سو گز گئی ہوگی کہ احسان ہانپتا کانپتا دوڑا آیا۔

اور دُور سے گاڑی بان کو آواز دی کہ روکو۔ گاڑی رُک گئی۔ احسان کا چہرہ غصہ

سے سرخ تھا۔ وہ برا بھلا کہتا ہوا اندر گھسنا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر جھٹکا دیا اور کہا:-

"کیمینٹ چور! روپیہ دیکر شاہ بنی۔ اور سارا زیور اڑا لائی۔"

احسان کا غصہ اس قدر تیز تھا اور اس قدر چلا رہا تھا کہ اسکی حالت دیکھ کر

لوگ سڑک پر کھڑے ہو گئے۔ اسباب نکال نکال کر باہر پھینکنا شروع کیا۔ اور زبان سے

وہ الفاظ استعمال کئے جن کو سنکر خلقت بھی دنگ رہ گئی۔ زاہدہ بخار میں لوٹنے میاں کی

صورت تک رہی تھی کہ احسان نے کہا "بتا کیمینٹ نامہ او زیور کہاں چرا کر رکھا؟"

زاہدہ - "مجھے معلوم نہیں میں تو دہن کے کمرے میں گھسی بھی نہیں۔"

احسان - "پکی چور ہے کیوں قید نہ لے لگی! اس جس کی کٹھیاں دے۔"

بخار کا زور چوری کا الزام خلقت کا از وہام۔ بد نصیب کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ وقت کی بات ہے کنجیاں نہ ملیں۔ احسان کو تاپ کہاں تھی۔ اتنا کہہ کر کہہ ہاں چوری نکلتی ہے کنجیاں تو آپ ہی سے کھوئی جائیں گی۔ پتھر سے قفل توڑا زبور کی پوٹی موجود تھی۔ نکال کر اس زور سے منہ پر ماری کہ چکر لگی۔ گاڑی کو ڈنکا گرہ لے گیا۔ نئی دہن دروازہ میں کھڑی تھیں دیکھتے ہی گھبرا کر پوچھا "کیوں ملا؟"

**احسان**۔ "ہاں کیوں نہ ملتا۔"

اسباب اُترا زاہدہ اندرائی۔ چوری کے غل غپاڑے سے محلہ کی عورتیں بھی جمع ہو گئیں۔ زاہدہ خاموش گم سم گھڑی تھی۔ اور کتنی تھی زمین شق ہو چلے اور میں سما جاؤں کہ دہن نے کہا۔

"خدا کا شکر ہے میں نے ابھی دیکھ لیا۔ ورنہ وہ تو میرے اوپر محفوظ ہی چلی تھیں۔"

**احسان**۔ "اری بول تو سہی جل جو گئی اچور! آنکھوں کا کاجل چورانے والی کبھی تجھ سے زیادہ نہ ہوگی کمبخت!"

محلہ والیاں بھی جو منہ میں آتا کہتی رہیں۔ اور کوئی متذنب ایسا نہ تھا جو زاہدہ پر لعن طعن نہ کر رہا ہو۔ ایک خاموش تصویر تھی ایک ساکت پتھر تھا ایک گم سم عورت تھی جس کی آنکھ سے متواتر آنسو کی لڑیاں بہ رہی تھیں۔ نگاہ اٹھتی نہ تھی۔ بات ہوتی نہ تھی۔ انتہائے ندامت تھی کہ دن رات دعائیں دیتے والیاں پکا چور کہہ رہی تھیں۔ دہن بولی "تو میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں۔ خدا معلوم کس وقت نکال کر رکھا۔ وہ تو خدا نے خیر کی کہ تم نے روپے مانگے۔ میں صندوق کھولنے لگی۔ دیکھتی ہوں تو پوٹی نڈا غضب خدا کا گھر میں یہ آفت کہو وہ کس کا تھا۔ کئی تو ایک ہی کی ہے۔ لہذا مال کس کا اور میرا کس کا؟"

نئی دہن کو شش میں نزعہ سے نئی کسی طرح ایسا دلیل اور ایسا رسوا کروں کہ احسان اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا کیسا اس کا نام تک نہ لے۔ مگر موقع کا انتظار تھا۔ اب جو زار اٹھا نے اسباب باندھنا شروع کیا تو پچھلے سے بکس میں زیور رکھ۔ خاموش آ بیٹھی۔ اور جب گاڑی روانہ ہو گئی تو میاں سے کہا کہ "زیور رکھ لگائیں" چوری پوری اور مال سامنے تھا۔ اس وقت تک احسان کی بدولت جس قدر مصیبتیں آئیں اٹھا نے ان کو راحت سمجھا۔ سو کن کے کانٹے پھول کی طرح گود میں لئے اور ناگ سے کھلونے کی طرح کھیلی۔ مگر اس صدمہ نے جان پر بنا دی۔ عورتیں صحن میں کچا کچھ بھری تھیں۔ نئی دہن نے ستم یہ کیا کہ اسی وقت اپنے رشتہ داروں کو بھی نہاٹا دیکھنے کے لئے بلا لیا۔ ہر طرف سے لعنت، اور ہر کونہ سے ملامت کی صدا بلند ہو رہی تھی۔ شام کے وقت احسان نے برابر میں ایک چھوٹا سا مکان کرایہ پر لے لیا تھا کہ بھینچنے کی تجویز کی اور کہا "تجھ چور مکار کی سزا تو یہ تھی کہ عمر بھر جیل خانہ میں سڑ سڑ کر مری مگر ہم شریف ہیں کہ اپنی شرافت سے کام لے کر تجھ پر رحم کرتے ہیں۔"

اب البتہ ایک جوش زار اٹھا کے سینہ میں اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گیا۔ اس کی آواز غصہ سے بھر ا گئی۔ اس نے سو کن کی طرف دیکھا اور کہا "انسان آنکھ سے پوشیدہ رہنے والا ہر معاملہ قدرت کی اس زبردست آنکھ کے سامنے ہے جو پہاڑ کی دھڑکیں چوٹی کے رینگنے کی اور کھوکھلے تنے میں کیرے کی حرکت کو دیکھتی ہو۔ شہادت صرف چشم ظاہری پر ختم نہیں۔ جن مظلوموں کا کوئی نہیں ان کی بے گناہی کا گواہ صرف وہ قدرت والا ہے۔ جو اس فانی جہم کو ایک روز خاک کر دے گا اور جانتا ہے کس نے زیور کی پوٹی اس بکس میں رکھی۔ میں نے اگر اس پر دیں میں اپنے خاندان کی آبرو اور اپنے باپ دادا کی لائے پر چوری کا الزام لگا کر نہ دوں گا کیا اور مردوں کو اذیت دی تو اس کا بہتر فیصلہ کرنے والا وہی حکم الحاکمین ہو۔ دنیا کی کسی حالت کو ثبات و زندگی کی

کسی کیفیت کو قیام نہیں۔ اطمینان عارضی اور خوشی چند روزہ بہان ہے جس طرح موت زندگی کی تاک لگائے بیٹھی ہے۔ اسی طرح بے اطمینانی اطمینان کے شکار ہیں مصروف ہے اولین یگم جس وقت نے مجھ سے وفانہ کی یہ غم سے بھی نہ کریگا۔ پانسانی ہستی جو شہر کی حیثیت میں میرے سامنے کھڑی ہو۔ اسکی بدولت بیٹے بھی اس دنیا میں راج کئے۔ مگر آج جب میرا تخت چھن گیا۔ اور میں سلطنت کھو کر تہاری دست نگر ہو تو صرف یہ خیال مجھے تقویت دے رہا ہے کہ سہاگ کے زعم میں نا اتفاقی کی آگ کو نذر امش نہ کیا۔ کوئی بات ایسی نہ کہی اور کوئی کام ایسا نہ کیا جو دوسروں کے واسطے کلفت اور اذیت ہو۔ میں نے تمہارے ساتھ اگر آج تک کوئی بُرائی کی ہو، کوئی ایذا پہنچائی ہو تو تم مجھے بتا دو۔ میں نے کدوے گھونٹ شہد کی طرح پئے اور زہر کا پیالہ امرت سمجھا۔ اس زہر کی سزا مارنے تھی کہ میری عزت اس بھرے مجمع میں اس طرح برباد ہو۔ اور میری چور کی غلط ڈھنڈورہ پردیس کی سڑکوں پر پڑے۔ خیر خدا کی مرضی اور شہر کی رائے سزا کھول پر۔ جو ہو گیا خوب ہوا، اور جو ہو گا اچھا ہو گا۔ لیکن وقت آئیگا کہ شاہ جعفری کی صدا واقعات سے تاریکی کا پردہ اٹھا دے گی۔ اور دُنیا دیکھے گی کہ زراہن بے گناہ تھی۔

بچکی بندھی ہوئی تھی، اور وہی درود یار جو رحمت برسا رہے تھے زراہن کی صداقت کا نعرہ لگانے لگے۔ احسان خاموش اور دہن ششدر تھی کہ زراہن آگے بڑھی اور شہر سے کہا چلو جس جگہ پہنچا ہے پہنچا دو۔ مؤذن اذان لے رہا ہوتا قضا ہو۔ ایک ایسی رنٹا رے جس میں سرتاپا ندامت شامل تھی احسان چلا۔ اور زراہن کو دوسرے گھر میں لے جا کر بٹھا دیا۔

## ستر ہواں باب

”وقت نے تم کو اتنا بڑا جھکو لا دیا اور وہ مصیبت ڈالی کہ اگر پتھر بھی ہوتا تو موم بن کر خدا



کے حضور میں گر پڑتا۔ اور ان لبتا کہ قدامت کے کیسے کیسے جو ہر تم نے  
خاک میں ملا دئے!

جن کو تم جاہل اور پھوہڑ کہہ رہی ہو وہ درحقیقت ایسی شخصیں کہ فرشتے ان کے  
دامن پر نماز پڑھتے۔ مگر افسوس تمہاری عقل پرنا اور تعجب تمہارے قیاس پر کہ اپنی آبرو  
گنوا کر بھی تمہاری عقل درست نہ ہوئی۔

شاہدہ۔ ”آپ ہر وقت مجھ کو اسی ایک بات کا طعنہ نہ دیا کیجئے۔ اس کو اس  
کیا واسطہ۔ میں جو بات کہہ رہی ہوں اس کا جواب دیجئے۔ یہ جو آئے دن کی بحث فقیر  
ہوتے تھے مومنے نماز سے گل کھلاتے رہتے ہیں کہیں کوئی صوفی بن کر زبور سے اڑے،  
کہیں کوئی تحن بن کر گھر موس لے گئیں، یہ سب قدامت کے کرشمے ہیں تو کیا ہیں؟ آپ  
ہی کا بیان ہے، بارہا آپ نے کہا، آپ کی والدہ صاحبہ نے فرمایا کہ آپ کی چچی جان  
کو ایک بڑھیا نے پیرانی بن کر ایسا دبوچا، اور اتنا صفایا کیا کہ دانتا کریر نے کا ترکا  
تک نہ رہا۔ اگر وہ پڑھی لکھی ہوتیں، ان بدعاشوں کے واقعات ان کے کانوں سے بکری  
چکے ہوتے، ان کشنیوں کی چالاکیاں وہ اخباروں اور کتابوں میں پڑھ چکی ہوتیں، تو کیوں  
اس کے چکے میں آتیں؟ شوہر کے گارڈھے پیسے کی کمائی بچوں کا محنت سے پیدا ہوا  
پیسہ اس طرح برباد نہ ہوتا۔ اماں جان آپ نے ان کی حالت پر تو ہمیشہ افسوس کیا مگر یہ بھی  
خیال فرمایا کہ آپ کے چچا جان پر کیا گزری ہوگی۔ جن کی جج جھٹھا ایک جاہل عورت  
کی بدولت کشنی کی نذر ہو گئی۔“

مال۔ ”تم ایک بات کو دوسری بات میں نہ ملایا کرو۔ میں نے ہمیشہ تمہارے  
سامنے اقرار کیا ہے کہ اگلی بیویاں باوجود ان تمام خوبیوں کے بخوان کا حصہ تھیں۔  
اس قدر بھولی ہوتی تھیں کہ کسی کو جھوٹا سمجھنے کا وہ ہم بھی ان کے دل میں نہ آتا تھا اور  
اگر تم غور کرو تو ان کی یہ تربیت کچھ غلط نہ تھی۔ اسلام کی تعلیم ہے کہ کسی مسلمان کی طرف سے

بظن نہ ہو۔ اب اس کا ذمہ وار وقت ہے کہ کیوں ہم میں ایسے مسلمان پیدا ہونے شروع ہوئے جو اسلام سے ہزاروں کیس دور رہے۔ اور روحانیت کو کھو کر نفسانیت میں غرق ہو گئے۔ تمہاری تعلیم کھرے اور کھوٹے کی تیز بتاتی ہے۔ اور میں اس کو ضروری سمجھتی ہوں لیکن ان کے یہاں کھوٹ کا وجود ہی نہ تھا اس لئے ان کو اس شناخت کی بھی ضرورت نہ تھی۔ اب البتہ اس تعلیم کی ضرورت ہے اور اگر بُرا نہ مانو تو اس کی ذمہ دار بھی ترقی ہے۔ اگر نامہ اس قسم کی ترقی نہ کرتا تو ہم بھی وہی سیدھے مسلمان ہوتے۔ مجھے اس سے انکار نہیں کہ گنڈے تعویذوں کی طرف ان کا عقیدہ پختہ تھا اور گو میں خود ان ڈھکوسلے باز پیروں کی قایل نہیں ہوں۔ مگر یہ ضرور کہوں گی کہ وہاں کے اثر کی میں قایل ہوں۔ اور اس کا فیصلہ تم خود اس طرح کر دو کہ اگر تم کو کوئی معمولی بات تمہارے مزاج کے خلاف کہہ دیتا ہے تو آگ لگ جاتی ہے۔ اور اگر کوئی عاجزی سے گزر گدا اگر کچھ عرض کرے تو خواہ مخواہ طبیعت میں رحم پیدا ہونا ہے۔ اسی طرح بندہ جب خدا کے حضور میں سچے دل سے رو کر کچھ مانگتا ہے۔ تو وہ سُنتا ہے اور ضرور سُنتا ہے۔ اسی سلسلے میں ان بزرگانِ دین کی دُعا شامل ہے۔ جو خدا کے پاک بندے سچے مسلمان اور نیک انسان ہیں یہ وجہ ہے کہ چچی جان گنڈے تعویذوں کی طرف جھکی ہوئی نہیں۔ ایسا بھی اگر کوئی ولی کامل نظر آجائے جس کا نظر آنا حال، تو سب سے پہلی عورتِ زمان کے ہاتھ پر سجدہ کرے میں ہوں۔ لیکن یہ موجودہ گنڈے اور تعویذ جن کی غرض صرف دھوکا ہے۔ فخارت سے رد کر نیوالی بھی میں ہی ہوں۔ تم نے ان کی اس غلطی کو تو پکڑ لیا۔ جو غلطی نہیں بلکہ تلاشِ حق تھی۔ اور ان کی نیت یقیناً قابلِ الزام نہیں مگر ان کی بھلائیوں پر بھی تو کبھی نظر ڈالی ہوتی۔ وہ وہ گریں کہ حج تم اور میں مکر بھی وہ جیسے یہاں نہ کر سکیں گی۔ دوپہر کا سنسان وقت تھا اگر مری دور شو رہے پڑے ہی تھی تمہارے ناز کے واسطے لوٹا بھر وضو کے لئے آ رہی تھیں کہ یہ صدا کان میں آئی۔

”ایک خدا کے وہ بندے ہیں جو قیدیوں کو آزاد کرتے ہیں۔ ایک تم ہو کہ مسلمان کو جیل خانے پہنچاتے ہو۔“

لوٹا چھوڑ کوٹھے پر گئیں، جا کر دیکھتی ہیں نو آدمیوں کا ٹھٹ کا ٹھٹ لگا ہوا۔ ایک ضعیف العمر انسان کو جس کی ڈاڑھی سفید بجلی کا پُر عدالت کے اہلکار گرفتار کیے کھڑے ہیں۔ اور ایک نوعمر انسان آنکھیں نکال نکال کر برا بھلا کہہ رہا ہے بڑھا خاموش تھا۔ اس کے لب پر تھ کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ قلم قلم کر ٹھنڈے سانس دیتا تھا اور آسمان کی طرف دیکھتا تھا۔ مجمع میں سے ایک شخص نے جوان آدمی سے پھر وہی الفاظ دہرا کر کہا۔ ”یہ شخص جوتج تھا را مقروض ہے۔ اس سے زیادہ بد نصیب آدمی دنیا میں مشکل سے ہوگا۔ اس کے سیاہ بال خلق اللہ کی خدمت میں سفید ہوئے اس نے سینکڑوں نہیں ہزاروں روپے یتیموں اور داندلوں کو دئے۔ محتاج اس کے ورے“ سائل اس کے گھر سے خالی نہ گیا۔ آج سے تین سال پہلے اسکی دولت کا ڈنکا تمام شہر میں بج رہا تھا۔ خدا کسی کو نہ بگاڑے۔ تم پر اس کے احسانات ہیں تم نے اس کا نمک کھایا۔ اس نے یتیم خانہ سے نمک لکر تمہاری پرورش کی۔ اپنے روپے سے تم کو اس قابل کیا کہ آج تم کا روبرو کر رہے ہو۔ کیا اسی دن کو کہ جب اس کا کاروبار بگڑ جائے یہ برابر کے جوان بیٹے کا جنازہ کندھے پر ڈھوئے۔ اور عمر بھر کی رفیق بیوی کو گہری گود میں سلا کر مسجد کے ایک کونے میں بیٹھ خدا کی عبادت میں مصروف ہو تو تم جھوٹے دعوے سے روپے کا مطالبہ کرو۔ اور اس کو گرفتار کر لو۔“

ضعیف العمر کی سفید ڈاڑھی آنسوؤں سے تر تھی۔ وہ آسمان کی طرف دیکھتا تھا اور نگاہ نیچی کر لیتا تھا۔ اس نے کچھ سوچا اور نوعمر کی طرف دیکھ کر کہا :-

”میں مائے پیتھ سے کچھ لیکر نہ آیا تھا۔ جو کچھ پیدا کیا اسی دنیا میں اور جو کچھ ختم کیا وہ بھی اسی دنیا میں جس طرح خالی ہاتھ مائے پیتھ سے آیا اسی طرح خالی ہاتھ۔“

قبر میں چلا جاؤں گا۔ روپیہ میرے پاس بھی نہ رہا۔ اور تمہارے پاس بھی نہ رہے گا۔ مگر اس کا اثر اس کا نتیجہ اور اس کا طفیل میرے پاس ہے۔ اور تمہارے پاس ہونے والا ہے۔ دنیا تماشہ گاہ ہے۔ یہاں نت نئے تماشے اور رنگ برنگ کے کھیل انسانی زندگی دکھا رہی ہے۔ جو ہر لمحہ اس وقت قیدی کی حیثیت سے دوسرے ہاتھ میں ہو۔ اس میں روپے کی ریل پیل تھی۔ اشرفیوں کا ڈھیر تھا۔ اور دولت کی بچھاڑ تھی۔ ہم پہ سیب سوانگ دیکھ چکے۔ اور اب مجبوراً چارہیں۔ میرے پاس اب کچھ نہیں۔ میری تمام کائنات ساری ملکیت، کل اثاثہ، ایک بدہتی، ایک تسبیح، اور ایک جانناز ہے۔ یہ اگر تمہارے کام آسکے تو شوق سے لو۔ خدا کی دنیا وسیع ہے۔ دریا کا کنارہ میری بدہتی۔ ہاتھ کی انگلیاں میری تسبیح، اور خنجر کی گھانس میری جانناز ہوگی۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے تم سے یا کسی سے کبھی فرض لیا ہو۔ میں نے اس پیٹھ پر پانی پلانی بٹی کھائیں۔ اور اب سوکھی روٹیاں بھی کھاتا ہوں۔ مگر میں نے جب میرا کام بگڑا میری بات گئی، آج تک کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلا یا۔ یہ ہاتھ جو اس وقت قید ہے اس کو خیر ہے۔ کہ سوا اس خدا کے جس کے سامنے پانچ وقت اٹھتا ہے کسی کے آگے دراز نہ ہوا۔ میں نوازی پٹنگوں پر سو یا۔ اور آج بان کی چار پائی مجھ کو میسر نہیں جس خانوں میں رہا۔ اور اب ٹوٹی جھونپڑی بھی میری ملکیت نہیں۔ میں ایک جوان بیٹے کا باپ اور ایک مسلمان عورت کا شوہر رہا۔ مگر اب نہیں ہوں۔ میری آنکھوں نے عیش کے جلسے دیکھے، اطمینان کی گھڑیاں دیکھیں، اور انہیں آنکھوں نے بیٹے کا مردہ دیکھا۔ بیوی کی لاش دیکھی لیکن خدا کی مرضی پر راضی اور اس کے حکم پر خوش ہوں۔ جس طرح فرحت میں مشاکر رہا۔ اسی طرح مصیبت میں صابر ہوں۔ مجھ کو تمہارے دعوے کی خبر نہ تمہارے مطالبہ کا علم۔ تم نے اصرار کیا کہ دعوت میں ضرور یک ہو۔ میں انکار کرتا۔ مگر اس لئے کہ تمہاری دل شکنی نہ ہو۔ حاضر ہو گیا۔ تم نے میرے ساتھ دھوکہ دیکر یہ داؤں کھیلے

مجھے جیل خانہ بھی غنیمت ہو گا۔ اور میں جس خدا کو یہاں یا دگر رہا ہوں، وہاں بھی فراموش نہ کروں گا۔ مگر بزرگ ہوں۔ نصیحت کرتا ہوں۔ سنو اور یاد رکھو دنیا فانی ہے یہ عمر ہینہ اور یہ وقت سدا رہنے والا نہیں۔ کام وہ کرو کہ نام نیک ہو۔ اور جب یہ عمر ڈھل جائے، اور یہ رنگ بگڑ جائے تو پچھتا نا نہ پڑے۔

میں غفلت ہوں میرے پاس روپیہ پیسہ کچھ نہیں۔ جوڑے کے سوا جو بدن پر ہے اور دوسرا دھوبی کے یہاں میرے پاس کپڑا بھی نہیں چلو، لے چلو جہاں لے چلنا ہے اور ہنچاؤ جس جگہ چاہتے ہو۔ ڈیڑھ سو روپے دے کر مجھے چھڑانے والے قردوں میں آرام کر رہے ہیں۔ چلو بسم اللہ کرو۔

خلقت کی آنکھ سے آنسو جاری تھے کہ چچی جان نیچے آئیں۔ انہوں نے ڈیڑھ سو روپے نکالے اور چچا جان سے تمام واقعہ بیان کیا۔ چچا جان کے کلیجے پر بھی چوٹ لگی۔ وہ روپے لے کر باہر آئے۔ اور انہوں نے وہ روپیہ پیش کیا اور کہا:-

”میری بیوی کی طرف سے جو کوٹھے پر آپ کی تقریر سن رہی تھی یہ ناچیز رقم قبول فرمائیے۔ اور قرض میں ادا کر دیجئے۔“

ضعیف العمر کی آنکھ اب خشک ہو چکی تھی۔ انہوں نے روپے کے لینے سے انکار کیا اور کہا:-

”میں مرد ہوں مجھے یہ حق حاصل نہیں کہ اپنی تکلیف کا بار ایک عورت پر ڈالوں۔“ مگر جب چچا جان نے زیادہ اصرار کیا تو انہوں نے روپیہ لے کر اس جوان کو دے دیا اور ایک پیچ مار کر یہ کہتے ہوئے گر پڑے:-

”جس دنیا میں بے گناہوں کو قید کر دینے والے مرد موجود ہیں ہاں روپیہ دیکر آزاد کرادینے والی مسلمان عورت خدا تجھ کو دین و دنیا میں خوش رکھے۔“

بات گئی گذری ہوئی، معاملہ ختم ہو گیا۔ جو واقعہ چچی جان دکھا گئیں اب تک زندہ ہے۔ اور گو وہ لوگ نہ رہے۔ مگر دیکھنے والے ابھی تک موجود ہیں۔ اور سُننے والے عرصہ تک موجود رہیں گے۔

تم نے ان کی ایک بات تو رٹ لی۔ جس میں ان کی نیت بخر تھی اور وہ بھی انہوں نے کسی لالچ یا توقع پر نہیں قرضِ حسنہ دیا تھا۔ لیکن اس واقعہ کا خیال نہ رکھا۔ جو ان کے دامنِ حیات پر سدا بہار پھول کی طرح کھل رہا ہے۔

## اٹھارواں باب

احسان۔ ”یہ آخر کیا مصیبت ہے جو آج پانچ روز سے ڈاک بٹھا رکھی ہے۔ صبح ہے تو شام ہے تو آخر ایسا کیا ضروری کام ہے کہ گھر میں بیٹھنے کا حکم ہی نہیں۔ کہو کیا کام ہے؟ کیوں بلارہی ہو؟“

زہرہ۔ ”اگر فرصت ہو تو تھوڑی دیر بیٹھ جاؤ۔ مجھے ایک ضروری بات دریافت کرنی ہے۔“

احسان۔ ”مجھے مطلق فرصت نہیں ہو۔ دلہن پیگم آج تاشہ میں جائیں گی۔ گاڑی کا انتظام کرنا ہے۔ میں کھڑے ہی کھڑے تمہاری بات سُن لوں گا۔ کہو کیا کہتی ہو؟“

زہرہ۔ ”پرسوں عشرہ ہے کچھ نذر تیار کرو گے؟“

احسان۔ ”مرٹ اسی واسطے بلایا تھا۔ افسوس۔“

زہرہ۔ ”اں بلانے کی غرض تو یہ ہی تھی۔ افسوس کس بات کا؟“

احسان۔ ”اس لغویت اور جہالت نے تم کو یہ دن دکھایا۔ اور ابھی تک یہ حرکتیں ختم نہ ہوئیں۔“

زہرہ۔ ”اس میں لغویت اور جہالت کی کیا بات ہے؟ میں دریافت کرنا

چاہتی ہوں۔"

**احسان**۔ "اس سے زیادہ اخیت اور کیا ہوگی! ایسی فضول رقم کس کے پاس دھری ہے کہ حاصل دین نہ دنیا، تمہاری اماں کی طرح دوسن حلیم رات بھر گھوٹے اور سن بھر کی کھیر پکائے۔"

**زادہ**۔ "میں تو صرف دریافت کرتی ہوں۔ اس میں ناخوش ہونے کی کیا بات ہے؟ ان کا فعل ان کے واسطے تمہارا تمہارے واسطے۔"

**احسان**۔ "خیر تمہارے رائے کیا ہے؟ محرم میں کیا ہونا چاہیے۔ کیا کوئی تعزیر میں بھی نکالوں؟"

**زادہ**۔ "نہیں یہ مطلب تو میرا نہیں ہے۔ ہاں یہ ضرور چاہتی ہوں کہ پیہ دھیلارو کھی سوکھی، جو اللہ نے دی ہو۔ شہیدوں کے نام کی نذر نیا زہ جائے۔"

**احسان**۔ "تمہاری آنکھوں پر جہالت کے ایسے پردے پڑے کہ کسی طرح اٹھ نہیں سکتے۔ آخر تم ہی جیسی عورت دہن پیگم ہیں۔ مگر کیا تعلیم نے خیالات میں ایسی شستگی پیدا کر دی ہے کہ گھر اور زندگی دونوں جنت بنے ہوئے ہیں۔ تمہارے ہی عقیدے کے موافق امام حسین علیہ السلام جو رسول اللہ کے واسطے تھے۔

جنت میں پہنچ گئے۔ اور تمہارا یقین ہے کہ سرفراہ میں جو انان بہشت کے۔ انکی مالہ تمہاری رائے میں خاتون جنت ہیں۔ اب تم ہی بتا دو کہ کیا وہ لوگ تمہاری اس فضول نیاز کے محتاج ہیں۔ او۔ اس کا نتیجہ سدا اس کے کہ تم چندا الفتوں کو کھالے کھلا دو اور کیا ہو سکتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ ان لغویات میں کیا مصلحت ہے۔ اس کی اصلی غرض صرف یہ ہے کہ مسجد کے ملانے جنہوں نے یہ ڈھکوسلے نکالے اس بہانہ سے ترمال اڑائیں۔ اور نذر نیاز کے مال ان کی خدمتوں میں پہنچیں۔ ایسا مفت کاروبار میرے پاس افسوس نہیں ہے۔ ہاں تمہارے والدین کے پاس ہو۔ تمہاری ماں جو کچھ کریں رست ہو۔"

**زاہدہ۔** ”تم بھی کیسے مزے کی باتیں کرتے ہو کیا محبت کا اظہار صرف حاجتمند کے ساتھ ہوتا ہے۔ خوشحال کے ساتھ نہیں ہو سکتا؟ غریب پر در آدمی اس کی حاجت رفع کر کے احسان کرتا ہے اور امیر کی محبت ناچیز تندر سے ظاہر ہو سکتی ہے۔ ہاں دل نے کیا پانی کے گھرے کی جواہری لیکر کیا تھا وقت نہ کی۔ نیت دینے والے کی دیکھو چاہیے لینے والے کی حیثیت نہیں۔ یوں تو خدا اور رسول کے نام کی بھی نیاز ہوتی ہے تو کیا خدا اور رسول ہمارے بھوکے ہیں۔ ہم خدا کے نام پر ایک اپنا چ کو پیسہ دیتے ہیں تو کیا ہمارا یقین یہ ہے کہ نعوذ باللہ خدا ہمارے ایک پیسہ کا محتاج ہے اس کی لاتعداد دولت اس کے ہتھیار خزانوں اس کی لاہ والی سلطنت میں ایک پیسہ کوئی ہستی نہیں رکھتا۔ لیکن خلوص سے دیا اور دل سے پیش کیا جائے تو وہی ایک پیسہ جڑ پا کر کر سکتا ہے۔ حضرت امیر حسین علیہ السلام بے یار و مددگار میدان کر بلا میں شہید ہو کر استقلال کا سچا نمونہ اور اسلام کی بے نظیر مثال دکھا گئے۔ وہ حضور اکرم کے ”نواسے“ خاتونِ جنت کے تحت جگر ہیں۔ ہم مسلمان ہیں۔ ہمارا کام ہے کہ اس ائمہ کو زندہ رکھیں اور انہی والی نسلوں کے دل سے اس سانچہ کو فراموش نہ ہونے دیں اس یاد کو تازہ رکھنے کی صورت سب سے بہتر یہی ہے کہ ہم اس روزان پاک روحوں کے کارنامے خود پڑھیں اور دوسروں کو سنائیں۔ اس کے ساتھ ہی جو کچھ خدا نے ہم کو دیا ہے وہ ان شہیدوں کے واسطے جہنم نے صداقت پر اپنی جانیں قربان کیں۔ خرچ کریں اور خدا سے التجا کریں کہ وہ پاک بندے جن پر تو اپنی رحمت نازل کر رہا ہے۔ جب ہماری تندر کے محتاج نہیں ہمارا یہ خیر ہر یہ ان کی خدمت میں پہنچا دے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم خود ہی سگے نہی ان کو پہنچے گا۔ وہ ان دنیا کے مکروہات کا کیا کریں گے۔ جہنم نے دنیا میں انکی پرواہ نہ کی۔ وہ آخرت میں اس سے مستحق ہیں۔ مگر ہمارا یہ فعل ان کی ہمت و صداقت کا اعتراف ہے۔ اور سب سے بڑا راز جو اس آئیں ہے وہ صرف اس قدر کہ اس طرح



ہم ان غریبوں کے ساتھ سلوک کر سکیں۔ جن کا کوئی والی وارث نہیں۔ اور جو دو دو دانوں کو محتاج ہیں۔ میں اس مسجد کی خدمت جس کی اذان کان میں آئے فرض سمجھتی ہوں۔ لیکن ہرگز ہرگز ان موٹے ٹنگروں کو دینا تو اب نہیں سمجھتی جو دھڑلے سے بھیک مانگتے ہیں۔ اور غصے کرتے ہیں۔ پردہ نشین رانڈیں ہیں، یتیم بچے ہیں، مسکین طالب علم ہیں، محتاج پانچ ہیں۔ میرے خیال میں اس گروہ کا ہم پر ضرور حق ہے۔ اور ہمارا فرض ہے کہ ہم کسی طرح زکوٰۃ سے، خیرات سے، صدقات سے، ان حاجت مندوں کی اعانت کریں۔ نذر نیاز سے غرض بھی ان ہی حاجت مندوں کی اعانت ہے۔ اور اس لئے میں نے تم کو تکلیف بھی دی۔“

احسان۔ ”یہ فضول باتیں ایسی ضروری نہ تھیں کہ مجھ کو اس طرح تکلیف دی جاتی۔ آئندہ احتیاط کرنا۔ اب میں جاتا ہوں۔“

## انیسواں باب

”جب تک اماں جان زندہ رہیں۔ میں نے اس وقت تک آپ کو ان سے کم نہ سمجھا، اور آپ کی رائے اور قیاس کی ہمیشہ وقعت کی اور اب کہ اماں جان جنت سدھاریں میری ماں آپ ہی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ آپ کہنے کو نہیں اتنی آپ میری ماں ہیں۔ اس وقت کوئی بڑا بوڑھا ایسا نہیں جو ہم کو نشیب و فراز سمجھائے۔ بیوی صاحبہ ہیں، وہ نور علی نور یہ کچھ ہو چکا۔ مگر وہ صاحبیت اب تک ختم نہ ہوئی۔ اماں جان بھی اللہ بخشے اس کی ہمیشہ نشا کی رہیں۔ میری غلطی تھی کہ اتنا میں آپ کی رائے کو مناسب نہ سمجھا۔ اس کا نتیجہ بھگت لیا۔ اب آپ اس وقت تشریف لے چلے اور خود چل کر جو مناسب سمجھتے وہ کہجئے۔“

ساس۔ ”نبیال یہ تمہاری سعادت مندی ہے۔ اور میں ہر طرح سے

تمہاری تجویز سے متفق ہوں۔ میں توکل بھی اسی واسطے وقت پر پہنچ گئی تھی کہ تم  
نا تجربہ کار ہو۔ کسی بات میں کسر نہ رہ جائے اللہ کا شکر ہے جو اصلی کام تھا وہ اللہ نے  
پورا کر دیا۔ اب جو کچھ ہے وہ دنیا کے جھگڑے اور ہمت کی جوت ہے۔ پھولوں کی  
بحث کل بھی میں سن آئی۔ تمہارے والد صاحب قبلہ اور تمہاری بیوی کا خیال  
تھا کہ پھول نفلوں ہیں۔ تمہاری پھوپھی اور خالہ دونوں بیویوں کی رائے تھی  
کہ ہوں اور ضرور ہوں۔ مجھ سے کسی نے صلاح نہ لی۔ نہ میں نے خود خیال مینا مناسب سمجھا۔  
حسن۔ "جی ہاں تو ان ہی باتوں کے طے کرنے کے واسطے تو آپ کی ضرورت  
ہے۔ اور تمام فیصلہ آپ کی رائے پر منحصر ہے۔"

حسن، ساس کو لے کر گھر آیا تو عورتیں بھری تھیں۔ اور مختلف بیویوں کی مختلف  
رائے تھی۔ کوئی کہتا تھا پھول ہوں۔ کسی کی رائے تھی نہ ہوں۔ بالآخر حسن کے والد  
دروازہ پر آکر سماعت سے کہا کہ پھولوں کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے اور اس رسم کا  
مردہ سے کیا تعلق ہے؟

سماعت حسن۔ "میں اس رسم کا مردہ سے کوئی تعلق نہیں سمجھتی۔ اور یہ وہ رسمیں  
ہیں جنہوں نے مسلمانوں کو تاراج و برباد کر دیا۔ اور اس کا تمام بار ان مسلمانوں کی گردن  
پر ہے جنہوں نے مذہب کی آڑ میں اپنے پیٹ بھرے اور نفس کے کارن دوسروں  
کی تباہی کو جائز سمجھا۔ جس دھڑلے سے جس دریا دلی سے اور جس اطمینان سے  
یہ رسم ادا کی جاتی ہے۔ اس کو دیکھ کر رونا آتا ہے۔ اور جس شوق سے جس رغبت  
سے اور جس محبت سے اڑانے والے ان کھانوں کو اڑاتے ہیں۔ وہ کچھ تعجب انگیز نہیں۔  
افسوس اس کا ہے کہ وہ مسلمان جن کا کام خلوص و ہمدردی تھا۔ صداقت سے لٹنے  
دور ہو گئے کہ دوسرے گھروں کی آگ سے انہوں نے ہاتھ تانے جائز سمجھے۔ مائیں  
جوان بیٹیوں کے لئے اور اولاد مایا پوں کے لئے سرکھائیں مگر یہ سنگدل بریائی تھیں

اڑا کر تو نمدوں پر ہاتھ پھیر پھیر کر ڈکا رہیں لیں۔ اس رسم کی غرض صرف اتنی تھی کہ زندے مرنے کو فراموش نہ کریں۔ اور چونکہ صدمہ تازہ ہے۔ لگی میں روپیہ عزیز نہ کریں بخدا کی اس مخلوق کے کام آئیں جماعتی زندگی فاقوں میں بسر کر رہی ہو۔ اور یہ یقین کر لیں کہ جس طرح وہ محتاج بندگان خدا کے پیٹ بھر رہے ہیں۔ اسی طرح خدا ان کے عزیز پر رحم کرے گا۔ جو آپ صرف خدا ہی کی اعانت کا محتاج ہے۔ یہ محتاج دوا پانچ دیکس جو دعویٰ حاجتمند ہیں وہ ہونگے جن کو سوکھی روٹیاں بھی بریانی سے زیادہ اور مزہ عفر سے بڑھ کر ہیں نہ کہ جو گھی میں تلنی اور گوشت میں خرابی کا امتیاز کریں۔

ایسے لوگوں کو کھانا کھانا اس قدر فضول اس قدر خلوت اور اس قدر رزق غلطی ہے کہ خدا ہر مسلمان کو محفوظ رکھے۔ اسی طرح مسلمانوں کا حج کرنا بھی کچھ کم نادانی نہیں۔ شتابش ہے ان بلانے والوں پر۔ اور صد آفریں ان آنے والوں پر جس قوم کی اخلاقی حالت اس قدر کمزور اور ایسی قابل ملامت ہو جائے اس میں جو کچھ بھی ہو وہ خلاف توقع نہیں۔ جو عورتیں اس ماسے جس کا ڈیل شیر پھر کر دنیا آکھو میں اندھیر کر گیا۔ یہ توقع رکھتی ہیں کہ کھانے پینے کی مراد میں کمی نہ کرے۔ مگر ان کے مرنے جو چوری دعا اور فریب کرتے ہیں تو تعجب کی کیا بات ہے؟ ضرورت تو صرف اتنی تھی کہ ایک گھر میں موت ہوئی۔ صاحب خانہ کے عزیز انا رب اپنا کھانا لیکر اس کے پاس آئے۔ خود بھی کھایا اس کو بھی کھلایا۔ اس کا دل پہلایا اور اس کے صدمہ کو زائل کرنے کی کوشش کریں کہ یتیم توڑیں جو مسلمان آج کل اس رسم کی بدولت توڑتے ہیں۔

لیکن میری بحث کا نتیجہ یہ نہیں ہے کہ پھولوں کی رسم قطعاً اڑا دی جائے۔ بلکہ اس کو تسلیم کرتی ہوں کہ مذہب سے اس کا واسطہ کچھ نہ ہو۔ لیکن یہ ہمارے وہ جوہر ہیں جن کے مٹانے سے ہم خود اگر نہ مٹیں گے تو شے سے بدتر ہو جائیں گے۔ ہم زندہ رہیں گے مگر اسلام ہم میں نہ ہوگا۔ میرا کہنا بظاہر تعجب انگیز ہے اور میں خود

اس رسم کی حمایت کر رہی ہوں جو ہماری بربادی کا پیش خیمہ ہے لیکن اسلام کے احکام ثابت کر رہے ہیں کہ ان کا نشانہ زیادہ تر یہ ہے کہ مسلمان باہمی محبت و اخوت نے زندگی بسر کریں۔ دولت مند اپنی دولت میں مست ہو کر حاجتمندوں کی تکلیف سے بے خبر نہ ہو جائیں۔ یہی غرض زکوٰۃ اور خیرات کی ہے کہ امیروں کی کمائی سے غریبوں کو بھی حصہ ملے۔ پھولوں کی رسم کا حاصل بھی رکھنے والوں نے یہ ہی رکھا ہے اور یہ ہمارا یقین ہے کہ خدا کسی کی محنت رائیگاں نہیں کرتا۔ جب ہم بلبلا کر اور گرگڑا کر اس سے التجا کریں گے تو وہ ہماری دعا سنے گا۔ اور جو کچھ ہم اس کی راہ میں دیں گے قبول کرے گا۔ اور دینے والے پر جو اپنے اعمال و افعال کی جزا و سزا میں مصروف ہے رحم فرما کر کچھ عذاب سے رہائی دیگا۔ مگر کیا میں یہ کہتی ہوں کہ پھولوں کی رسم جس طرح ادا کی جا رہی ہے اسی طرح ادا کی جائے؟ تو یہ تو بے ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔ فرض لے کر پھول کرنے اور حیثیت سے بڑھ کر کھانا پکوانا گناہِ مست گناہ۔ میری غرض صرف اتنی ہے اور جیسا کہ میں ابھی کہ چکی ہوں کہ میت کے وارث اس وقت دل کی لگی میں تو سب کچھ کر لیں گے۔ اور بعد میں جب صدمہ زائل ہو گیا تو پھر کون کسی کو پوچھتا ہے۔ اور کون کسی کو دیتا ہے۔ ضرورت ہے کہ ما جس طرح زندگی میں بچہ کا کھانا پکاتی تھی اسی طرح جو کچھ خدا نے اس کو دیا ہو۔ معمولی کھانا۔ جو وہ روز کھاتی اور کھلاتی تھی اب بھی پکائے۔ شوہر جس طرح بیوی کی موجودگی میں کھانے پینے کا انتظام اپنی حالت کے موافق کرتا تھا۔ اب بھی کرسے اور یہ معمولی کھانا ان راناڑوں کو جن کی گودوں میں یتیم بچے ہیں۔ ان یتیموں کو جن کا پیٹ بھرنے والا خدا کے سوائے کوئی نہیں اپنے پاس بٹھا کر اپنے ہاتھ سے کھلائے۔ اگر آپ اس طرح پھولوں کی رسم انجام دیں اور یہ اہتمام کریں کہ حاجتمندوں کے سوا دوسرے کو جو واقعی حاجت مند نہیں کھانا نہ دیا جائے تو اس کو ضرور انجام دیجئے۔ اور یہ رسم اس صورت میں آکر یہ حق رکھتی ہو کہ ہرگز رکھی جائے۔ افسوس

اس بات کا ہے کہ اس رسم کی جس قدر ممانعت ہو رہی ہے گو وہ ممانعت کے قابل ضرور ہے۔ مگر مخالفین اس کے ساتھ ہی اس کی اصلیت کو بھی پامال کر رہے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اخوت اسلامی کے جوہر بھی زائل ہونگے۔ اور رفتہ رفتہ اس مذہب رسم کے ساتھ ہی ہمدردی کا درخشندہ جوہر بھی خاک میں مل جائیگا۔

سمدھن کی گفتگو سن کر باپ اور حسن دونوں اسی صلاح پر متفق ہوئے۔ کہ چھوٹوں کی رسم اس طرح ادا کی جائے کہ کھانا گھر میں پکایا جائے اور حسن اپنے ہاتھ سے لے جا کر ان پردہ نشین رانڈوں کی خدمت میں پیش کرے۔ جن پر کر کے کے فاقے پڑ رہے ہیں۔ اور اس رسم کا خاتمہ اسی دن ختم نہ ہو بلکہ ہر شنبہ چار آدمیوں کا کھانا دونوں وقت ایسے لوگوں کو دیا جائے جو دائمی حاجمند ہیں۔

سمدھی اور داماد سے یہ گفتگو کرنے کے بعد ماہی کے کمرہ میں آئی جو آب علییہ مکان سے اٹھ کر ساس کے پاس آگئی تھی۔ دیکھتی ہے تو مشاہدہ ایک آرام کرسی پر پڑی جھبول رہی ہیں۔ اور کمرہ میں کتے لوٹ رہے ہیں۔ چاندنی سکرسی ہوئی، درمی تھڑی ہوئی، کاغذ بکھرے ہوئے، کوڑا پھیلا ہوا۔ کمرہ کیا کاچھی کی دوکان ہے کہ چاروں طرف ہر قسم کا اسباب موجود ہے۔ آج بیٹی نے اتنی عنایت تو ضرور کی کہ ماکوٹھ کر کھڑے ہو کر نہیں بیٹھے ہی بیٹھے، اور بیٹے ہی بیٹے، آداب یا تسلیم اور سلام نہیں مانگے پر ہاتھ رکھ لیا۔ مانے دُعا دی۔ ادھر ادھر دیکھا اور کہا:-

”بیٹی! اتنی عورتیں بھری پڑی ہیں۔ اگر کوئی ادھر آگئی تو کیا کہے گی۔ کمرہ بھی ٹھیک نہ کیا۔“

شاہدہ:- ”دونوں تانوں میں سے ایک بھی کجنت آج نہ آئی۔ حالانکہ جانتی تھیں کہ کس قدر اشد ضرورت ہے۔“

مال:- ”ہاں غلطی تو ماموں کی ضرور ہے۔ لیکن اسی دن کو تو کہتے ہیں کہ ہم کو

تمام کاموں کی عادت ڈالنی چاہیے۔ تاکہ یہ نہ ہو کہ ایک روز مایا نوکر بیمار پڑ جائے تو ہاتھ ہی کٹ جائیں۔ یہ لوگ کچھ آج ہی پیدا نہیں ہوئے۔ پہلے بھی ذکر کیا کرتے تھے۔ اور ہم نے بھی نوکروں ہی میں آنکھ کھولی۔ مگر ہماری بڑی بوڑھیوں نے نوکروں کو اس نظر سے دیکھا ہی نہیں کہ ہماری زندگی کا تمام دار و مدار ان پر ہے۔ اور یہ ہیں تو کچھ اور نہیں ہیں تو کچھ نہیں۔ باوجود یہ سمجھنے اور ان پر بھروسہ نہ کرنے کے محبت کے تعلقات ایسے ایسے تھے کہ مائیں مر کر اور نوکر مجبور ہی ہو کر گھر سے نکلتے تھے۔ یہ نہ ہونا تھا کہ آج کلن کی اماں روٹی پکا رہی ہے تو پرسوں مرزا کی بہن۔ روز ماماؤں کی بدلی تھی ہے۔ میں نے تو کسی تعلیم یافتہ لڑکی کے پاس برسوں کی ماما عام طور پر دیکھی نہیں۔ آج یہ ہے تو کل وہ مرنے والیوں میں یہ کمال تھا کہ اس اُلفت اور اس محبت پر کہ ماماؤں کو اپنے عزیز کے برابر اور رشتہ دار سے کم نہ سمجھتی تھیں۔ یہ ممکن نہ تھا کہ ان پر بھول کر گھر کے کام کاج کو بھول جائیں۔ وہ ماماؤں کو اپنا مددگار سمجھتی تھیں۔ کام خود کرتی تھیں اور مدد ان سے لیتی تھیں۔ میں نے اپنی ان ہی آنکھوں سے ان جتنی بیویوں کو دیکھا ہے جن کے بچے اشرفیوں میں کیلتے تھے۔ اور پیسوں کی جگہ روپے اٹھاتے تھے۔ مگر میں نے تو ہمیشہ یہ دیکھا کہ ماما کے آنے سے پہلے گھر چندن کر کے رکھ دیا۔ اپنے ہاتھ سے جھاڑو بہا کر اپنے ہاتھ سے ٹھنڈا گرم پانی۔ ماما آئی اس نے اور کام کئے۔ اس کے ساتھ ہی باورچی خانہ میں گھسیں اور جب تک کھانا تیار ہوا لگی لیٹی رہیں۔ ماماؤں ان کی مدد گار ضرور تھیں۔ مگر وہ ماماؤں کی محتاج نہ تھیں۔ تعجب ہے کہ تمہارا دل کس طرح اس کوڑے پر بیٹھنے کو چاہتا ہے۔ مجھ سے تو دم بھر بھی نہ بیٹھا جائے۔ اسی لئے تو بارہ مہینے ریختی رہتی ہو، اٹھنے سے تم کو وحشت، کام سے تم کو نفرت، صحت بگڑے گی نہیں تو سنو ریگی؟ لاؤ جھاڑو دو میں دوں۔ یہ غصہ بھی کہیں دیکھا کہ گھر میں عورتیں آتی ہوں اور بہو کے کمرے کا یہ ہڈا!

شہادہ۔ ”مجھے تو معلوم نہیں وہ کجنت کہاں جھاڑو رکھ جاتی ہے۔“

ماں نے چاروں طرف دیکھا مگر جھاڑو نہ ملی۔ مجبور بچاری نے ایک میلہ کپڑے سے جھاڑو کا کام لیکر گھر کو ٹھیک کیا اور کہنے لگی۔

”کہو بیٹی تم نے ساس کو کیا بھیجا۔ اللہ بخشے کیسی خوبوں کی بیوی تھیں جس طرح مجھ سے کہا تھا کہ سدا بیٹی سمجھوں گی۔ اسی طرح نبیہ گئیں! ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔“

شہادہ۔ ”تعب ہے کہ آپ ان کی بھی تعریف کر رہی ہیں۔ جن کو کوئی اچھا نہیں کہتا۔ مجھ کو تو انہوں نے ہمیشہ دشمن سمجھا اور دشمن رہیں۔ آپ ان کی تعریف کرتی ہیں کمال ہو۔ میں ان کو کیا پہنچاؤں گی۔ میرا بس چلے تو جو کچھ ان کو دواں ملے وہ بھی چھین لیں۔“

ماں۔ ”موت ان ہی کو نہیں آئی۔ جس نے ماں کا پیٹ دیکھا وہ گور کا منظر دیکھے گا۔ تم کو بھی اور مجھ کو بھی ایک روز یہ ڈانٹ چکھنا ہے۔ مگر کسی کو برا کہنے سے پہلے یہ تو سوچو کہ آخر تم نے بھی کچھ ایسے کام کئے کہ لوگ تم کو اچھا کہیں۔ وہ تمہاری بزرگ تھیں، تمہارے کرتوتوں سے جلتی اور گڑوں سے بھلتی تھیں اس لئے خفا رہتی تھیں۔ تم انکو مرنے کے بعد برا کہتی ہو۔ کیا تم کو معلوم نہیں کہ مردے کو برا کہنا اچھا نہیں۔ اسکو بھلائی سے یاد کرو کہ وہ خدا کے نزدیک بھی اچھا ہو جائے۔ کیونکہ جو آدمیوں میں اچھا ہو وہ خدا کے ہاں بھی اچھا ہے۔ دُنیائیں وہ تمہاری دست نگر تھیں۔ لیکن آج وہ تمہاری مغلج ہیں۔ ان کا تم پر یہ حق ضرور ہے کہ تم جو کچھ تمہارے ہاتھ سے پاؤں سے زبان سے ہو سکے انکی خدمت کرو۔ میں عشا کے بعد اس وقت تک نہیں سوتی۔ جب تک اپنے سب عزیزوں کو تھوڑا تھوڑا پڑھ کر نہ پہنچا دوں۔ ایک سورہ بے سفت اور ایک سورہ بقرہ روزانہ ہوتی کہ اس کا ثواب ان مرنے والوں کو پہنچے۔ تم اس ثواب کی بھی قائل نہ ہو گی۔ مگر اس کی قسمی اس وقت کھلے گی جب عزیز گھری گور اور جنگل بیابان میں سدا کر گھر چلے آئیں گے۔“

میرے پیٹ کو یہ آگ لگی کہ تم جیسی بچی پیدا ہوئی جو زندوں کو کیا مردوں سے

بھی نہ ڈرے رکھتے ڈر خدا سے مرے کو مرنے سمجھ ادا اس وقت کی بھی کچھ تیاری کر  
جب یہ شوں شاں اور یہ دھوم دھام خاک بھی کام نہ آئے گی۔ اسی واسطے اللہ بچنے  
مرنے واسے اس بات کا لحاظ رکھتے تھے کہ بچوں کی زبان سے کسی نہ کسی طرح خدا کا  
مقدس کلام ادا ہوتا رہے۔ ماں جان عورت ہیں۔ مگر جس حافظ سے جی چاہے مقابلہ  
کر لو ذرا سی غلطی پر فوراً ٹوک دیں گی۔ ایک تم بھی مسلمان اور مسلمان کی اولاد ہو کہ درود  
شریعت بھی صحیح پڑھنی نہیں آتی ہو گی۔ اللہ رحم کرے۔

## بیسواں باب

”ایک مصیبت تو یہ آئی ہی تھی کہ لڑکری چھوٹی، اب اس پر غضب یہ ہے کہ  
ڈیڑھ سو روپے کا قرضہ۔ ڈیڑھ سو روپے سا قرضہ چل نہیں سکتیں۔ ان کے والدین نے  
صاف انکار کر دیا۔ اب میرا ایک دن یہاں آفت ہو۔ میں نے جو کیا وہ بھگتا اب اپنی  
غلبی پر نام اور عقل پر روتا ہوں۔ میں نے دوسرے نکاح کا مزہ چکھ لیا۔ اور اس وقت  
اس نیک بخت نے صاف طور پر کہہ دیا کہ میں اپنے بابا چھوڑ رہا ہوں۔ سا قرضہ ایسی ریت  
میں پر دیں جا کر کیا کروں۔ کہ تم خود پر کار ہو۔ جب ملازمت کا سلسلہ ہو جائے تو بلا  
لینا۔“ چار سو روپے جمع کئے اور رکھوائے، اس وقت مانگے تو وہ اور ان کے بابا  
سب جان کو آگے کہ ”شرم نہیں آتی۔ یہ کیا پیچھے بیچ کر فائدے کرے گی؟“

تراہدہ۔ ”یہ تو وہ جانے اور اس کا کام۔ قرضہ جو ڈیڑھ سو کا ہے۔ وہ تم ادا  
ادا کر دو۔ دس روپہ جینہ کے حساب سے جو تم مجھ کو کپڑا لے اور پان چھایہ وغیرہ کا  
دیتے تھے وہ یوں کاپیوں ہی رکھا ہے۔ میں نے تو کوئی بارہ تیرہ روپے اٹھائے ہیں۔  
یہ روپے حاضر ہیں شوق سے لیجاؤ اور دیدو۔“

صبح کا بھولا اگر شام کو گھر آجائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔ احسان اگر پہلے ہی



موفقہ پر حسب بیماری میں دونوں بیویوں نے تعلیم قدیم و جدید کے نمونے پیش کئے کوئی نتیجہ نکالنا چاہتا تو اسے صاف معلوم ہو جاتا کہ یہ موجودہ تعلیم نسواں جتنک بزمِ ہب کے رنگ میں نہ آئے خواہن اسلام کے جو ہر پاہاں کرتی رہے گی۔ اس وقت البتہ اس کو ایک چھکولالگا۔ اور اس کے دل نے بیباختہ صدا دی کہ زاہد کا پرستش کے قابل بیوی ہے کہ میرے تمام مظالم برداشت کئے اور اُن کی۔ یقیناً اس نئی دہن کی شرارت تھی کہ ایسی سیدھی اور بھولی بیوی کو اس طرح بزدل کیا۔ ابھی یہ فیصلہ یک سوئہ ہوا تھا کہ بیوی نے رومال کی پوٹی ہاتھ میں لاکر دی جس میں روپیہ بندھے ہوئے تھے۔ منصفانہ نظریں اٹھیں۔ اور قدامت کے ساتھ بیوی کے چہرے پر پڑیں۔ تو دیکھا تو کروں پر راج کرنے والی بیگم آج شوہر کے طفیل اس حالت میں ہے کہ کرتہ میں پیوند اور دوپٹہ میلہ چھٹ !

بیتاب ہو گیا۔ آنکھ میں آنسو آگئے۔ باہر آیا اور چنیں مارا کر دیا۔ روچکا تو آنسو پونچھے۔ قرضہ کا روپیہ ادا کیا۔ سوچ رہا تھا کہ کس طرح بیوی سے جا کر اپنی گزشتہ خطاؤں پر قدامت کا اظہار کروں۔ اور معافی کا طلب گار ہوں کہ ایک لڑکے نے سامنے سے آکر خط دیا۔ کھولا تو لکھا تھا :-

”ڈیر احسان !

میرے اس وقت کے ساتھ نہ چل سکنے کو تم امر مجبوری سمجھتا ہیں جس طرح تمہاری فرمانبردار ہوں۔ اسی طرح والدین کی مصلحت یہ ہی تھی اور ہے۔ میں مسلمان ہوں اور حقوق اسلام کے بموجب تمہاری زندگی کی شریک۔ کوئی وجہ نہیں کہ تمہارے حکم کی تعمیل نہ کرتی۔ مگر اس مصلحت کا نتیجہ تم کو جلد معلوم ہو جائے گا۔ جس وقت بلاؤ گے میں اسی وقت سر نکھوں۔ تمہیں حاضر ہوں گی۔ ہاں ایک بات کا انتظام

کرتے جاؤ۔ میں تم کو تکلیف نہ دیتی۔ مگر یہ مجھ سے زیادہ  
 تمہاری عزت کا سوال ہے۔ دسمبر کے چوتھے ہفتے میں انجن  
 خاتین ہند کا اجلاس ہے۔ اور میرا نام شائع ہو چکا ہے۔ تم  
 سمجھ سکتے ہو ایسی حالت میں میرا جانا کس قدر ضروری ہے۔ اس  
 وقت تک تو میرا خیال یہ ہے کہ موت کے سوا کوئی طاقت مجھ کو  
 وہاں جانے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ اس لئے میں سب سے پہلے تم کو اطلاع  
 دیتی ہوں۔ کیونکہ میں اس کو نہایت ضروری خیال کرتی ہوں اور اس کے  
 بعد ایک اور اشد ضرورت پر توجہ کرتی ہوں۔ اور وہ یہ کہ جلسہ کی شرکت  
 قابل میرے پاس کوئی لباس نہیں۔ وہاں لیڈیز، وزمانہ کپڑے بدلتی ہیں میں  
 کم از کم چار روز میں نو دو جوڑے تبدیل کروں۔ زیور نو خیر خدا کا دیا ہوتا تو  
 اچھا تھا۔ نہیں تو اب چوری تو کرنے سے ہے۔ ہاں کپڑا تو زرا ڈھنگ کا ہو  
 کہ کسی کی نظر میں حقیر نہ ہوں۔ تم کو معلوم ہے کہ مجھ کو مصالحہ وغیرہ سے نفرت  
 ہے۔ میں ایسی جگہ ہرگز روپیہ صرف کرنا پسند نہیں کرتی جہاں روپیہ کا بیسہ بھی  
 نہ رہے۔ البتہ جو ضروری چیزیں ہیں ان سے منہ نہیں۔ دو جوڑے زیادہ  
 سے زیادہ ڈیڑھ سو روپے میں تیار ہو جائیں گے۔ اگر تم ہزار کا حساب  
 بیباقی کرو تو اس رقم کے ساتھ ہی اس کا بھی فکر کر لینا۔ اور اگر اس میں وقت  
 ہو تو میں ہرگز ہرگز نہ کو ادیت دینی نہیں چاہتی۔ تم اسی سے قرع کا انتظام  
 کرو وہاں سے بھیج دینا۔ میں تم کو تکلیف نہ دیتی اباجان سو کہہ دیتی وہ بنوا دیتے۔  
 اور میں نے یہی سوچا بھی تھا۔ مگر اب جو غور کرتی ہوں تو مجھ کو ایسی فرحت  
 کرنے کا کوئی حق نہیں۔ میں طبیعت کچھ ایسی ہی لے کر آئی ہوں کہ نا جانہ  
 مطالبہ کو پسند نہیں کرتی۔ مجھے یہ بھی گوارا نہیں کہ اپنے اخراجات ان کے

اوپر ڈال دوں۔ مگر کیا کروں مجبور ہوں۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ تم کو مفصل کیفیت سناؤں۔ میں اگر معمولی لباس میں شریک ہوئی اور تو خدا نخواستہ ہونے ہی کیوں لگی۔ تو مجھ سے زیادہ تمہاری آبرورہائی بچے گی۔ میں اس موقع پر خاموش بھی ہو جاتی۔ اور مالدیتی۔ مگر خدا خدا کر کے تو سال بھر میں یہ موقع نصیب ہوتا ہے کہ کچھ قوم کی خدمت ہو سکے۔ اور شاید یہ ہی کام خدا قبول فرمائے۔ دوسرے مسلمانوں کی جو حالت ہیں اور کی تو نہیں کہہ سکتی۔ میری کیفیت یہ ہے کہ دیکھ دیکھ کر تڑپتی ہوں۔ امیسا کہ یہ تجویز میں ضرور کارگر ہوں گی۔ اور مسلمان عورتیں جہالت کے گڑھے سے نکل کر علم کی روشنی سے منور ہوں گی۔

تم کو اس کے انتظام میں اگر زیادہ تردد ہو تو میں ایک اور تدبیر بتاتی ہوں۔ تمہاری بیوی صاحب کے پاس بہت سا زبور ہے جس کو وہ ہمیشہ دوسرے کی امانت بتاتی ہیں۔ حالانکہ میں خود اُن کو استعمال کرتے دیکھ چکی ہوں۔ وہ اس قدر کافی ہو کہ نیکو سال دو سال بھی لو کر ہی نہ لے تو پریشانی نہ ہوگی۔ اس میں سے تم ڈیڑھ سو روپے کا انتظام کر سکتے ہو۔ میں نے خود ہی یہ پرچہ تم کو لکھا ہے۔ ابھی گھر میں کسی سے ذکر نہیں کیا۔ اباجان تمہارے پاس آئے کا قصد کر رہے کہ لڑکی کے اخراجات کا انتظام عدالت کے ذریعہ سے کر لیں مگر میں نے ان کو روک دیا اور کہا کہ اب اس کا فکر نہ کیجئے۔ میں نے ان کو منع کر دیا۔ مگر تم جس طرح ہو اس انتظام آج ہی کر دو۔ ایسا غضب نہ کرنا کہ یوں ہی چلے جاؤ۔ کیونکہ اباجان کی عادت سے تم واقف ہووہ پھر روکے نہ رکھیں گے۔

ایس۔ احسان

خط کے پڑھتے ہی احسان کے چھٹکے چھوٹ گئے۔ اور ہوش جاتے رہے۔  
 اٹھا۔ ایک سرسبز شاداب قطعہ پر جہاں سبزہ کا نخلی فرش چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔  
 بیٹھا۔ اور سوچنے لگا کہ بیٹھے بٹھائے کس مصیبت میں پھنس گیا میں تو سمجھا تھا کہ سکول  
 کی تعلیم پائی ہوئی بیوی میری زندگی درست کر دے گی۔ مگر یہ کجنت لوہا کی چھینچند ہو گئی۔  
 کچھ ایسی پڑھی لکھی بھی تو نہیں۔ نقطہ لباس اور گفتگو ہی تعلیم کی دیکھ لو۔ زارہ کا کی قابلیت  
 اس سے ہزار درجہ اور اس کی عادتوں و خصالت اس سے لاکھ مرتبہ افضل ہے۔ ایسا اس خط  
 کا کیا جواب دوں۔ یہ تو ایسے شو سے پشت لوگ ہیں کہ اگر نکار کرتا ہوں تو نہ معلوم کس  
 مصیبت میں ڈوا دیں گے۔ خیر اب ایک صورت ہے کہ میں بھی چالاکی سے کام لوں  
 اور کسی طرح ان مکاروں کے پھندے سے نکل کر گھر پہنچوں۔ وہاں پہنچ کر تو میں انکی  
 ہوشیاری و مکاری سب کچھ لوں گا۔ لیکن اس معاملہ میں زارہ کی صلاح ضروری ہے۔  
 یہ فیصلہ کر احسان گھر آیا تو زارہ کا کی صورت ظاہری ایک نشتر تھا۔ جو اس کے  
 کلیجہ میں گھسا۔ وہی بیوی جس کی بیگم تھی۔ اس وقت لونڈیوں کے ہڈے میں نظر آئی  
 خیال کیا تو اس تمام انقلاب کا ذمہ دار احسان اور صرف احسان۔ زیادہ غور کرنے لگا تو  
 نفس نے ملامت کی اور آواز بلند کہا کہ اس تغیر پر بھی اس کے جوہر اسی آب و تاب سے  
 چمک رہے ہیں۔ اس نے اپنے فرائض کی ادائیگی میں اس وقت تک کسر نہ کی اور اب تک  
 کہ میں نے اس کو ان حالوں پہنچا دیا۔ اسی طرح میری عزت کی خواہاں اور میرے بھرا  
 کی جویا ہے۔ آگے بڑھا اور وہ خط دکھا کر کہا :-

”لوہا بتاؤ میں کیا کروں؟“

زارہ نے خط پڑھا اور کہنے لگی :-

”ان کا یہ کہنا غلط ہے یا صحیح یہ تو تم ہی فیصلہ کرو مگر اس میں کیا کلام ہے کہ اب

وہ اپنی ضرورتوں کا اظہار تم سے نہ کریں تو کس سے کریں۔“

**احسان۔** ”تو کیا تم اس پر رضا مند ہو کہ میں تمہارے زیور میں سے ڈیڑھ سو روپے دیدوں۔“

**زاہدہ۔** ”میں تمہاری ضرورت کے مقابلہ اور تمہارے حکم کے سامنے انکار کی مجال تو نہیں رکھتی۔ مگر یہ ضرور کہوں گی کہ وہ چونکہ میری ملکیت نہیں اس لئے مجھے اس کے دینے کا بھی حق حاصل نہیں۔ تمہاری ملکیت ہے۔“

**احسان۔** ”پھر کیا کرنا چاہیے۔ افسوس یہ ہے کہ میں دونوں جہان سے گیا۔ تمہاری تکلیف کا بار میری گردن پر سخت ہے۔ اور مجھے اس کا صدمہ ہے کہ میں نے غلطی کی۔“

**زاہدہ۔** ”میرا تو تم مطلق خیال نہ کرو۔ میں جس طرح پہلے تمہاری لونڈی تھی آج بھی ہوں اور انشاء اللہ ہمیشہ رہوں گی۔“

**احسان** نے دل میں کچھ فیصلہ کیا۔ اور بیوی سے صرف اتنا کہہ کر باہر آیا: ”اسباب وغیرہ باندھ لو۔“

گاڑی کرایہ کی کی اور کہا ”مغرب کے بعد لے آنا۔“ شام ہوتے ہی احسان زاہدہ سمیت گاڑی میں بیٹھ روانہ ہو گیا۔

مغربی تعلیم یافتہ بیوی کا دھڑکا شکے سے کم نہ تھا۔ رستے بھر احسان کو کھٹکا رہا کہ اب کوئی آیا۔ اور گاڑی روکی۔ صبح چار بجے کے قریب اسٹیشن پر پہنچے تو سردی خوب شدت سے تھی۔ مسافر خانہ کے کمرے میں لیجا کر بیوی کو ٹھہرایا۔ یہاں ایک لمبی تپائی پر ایک مسلمان خاتون لیٹی ہوئی تھی۔ اسکی آنکھوں پر عینک تھی۔ اور لباس کی کوئی چیز انگریزی عورتوں سے کم نہ تھی۔ ہاتھ میں کتاب تھی۔ اور نگاہ نیچے۔ ایک عورت فرس چلائے اور اپنے بچہ کو لٹائے بیٹھی تھی۔ زاہدہ کا خیال تھا کہ بڑھی بکھی بیوی اسکی رت بچہ کر

اُٹھ کھڑی ہوں گی۔ تپائی چونکہ سرکاری ہے کم سے کم اتنا تو کہیں گی آئیے بیٹھ جائیے۔ مگر اس کا خیال پورا ہونا تو درکنار ان بیوی نے نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ زانوں نے دوسری طرف دیکھا تو دوسری تپائی اسباب سے رکی ہوئی تھی۔ دوسری بیوی سے پوچھا "یہ اسباب آپ کا ہے؟"

"عورت۔" "جی نہیں ان میں صاحبہ کا ہے۔"

"تعلیم یافتہ۔" "کیوں آپ کا کیا مطلب ہے۔"

"زاہدہ۔" "میں بیٹھنا چاہتی ہوں۔"

"تعلیم یافتہ۔" "آپ نیچے بیٹھ جاسیے۔ یہ پنج آپ دیکھتی ہیں رکی ہوئی ہو۔"

مہربانی فرما کر دروازہ کھول دیجئے کہ تازہ ہوا آتی رہے۔"

اتنا کہہ کر تعلیم یافتہ بیوی نے کتاب پڑھنی شروع کی۔ کتاب تو اردو ہی کی

تھی۔ مگر الفاظ یہ تھے:-

۱۔ کیٹ - رین

A cat ran

دس بک از مان

This book is mine

زاہدہ کو ناگوار تو بہت ہوا زیادہ تر اس لئے کہ انٹی انگریزی وہ بھی

سمجھتی تھی۔ جلی بھی اور نہی بھی۔ مگر ضبط کیا اور دروازہ کھول دیا۔

"تعلیم یافتہ۔" "تھینک یو۔"

"عورت۔" "ایک ذرا اوپر کا کواڑ بھیر دیجئے کہ ہوا بہت تیز ہے اور

میرا بخار زدہ بچہ اچھلا پڑتا ہے۔"

"تعلیم یافتہ۔" "میں نے آپ سے کہا کہ ایک آپ کے بچہ کی وجہ سے دوسرے

پیار نہیں ہو سکتے۔ آپ دیکھتی ہیں کہ تازہ ہوا کے داخل ہونے کا یہاں کوئی راستہ نہیں۔ صرف یہ دور و شندان ہیں جو کافی نہیں ہو سکتے۔ یہاں آدمی چار میں ہم کو کافی آکسیجن کی ضرورت ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم کاربن میں رہیں۔ آپ کو کوئی حق نہیں کہ اپنے پیار بچے کو لیکر سفر کیجئے۔ اور دوسروں کو ادبیت پہنچائیے۔

**عورت**۔ "نہیں بی بی میں تو تکلیف نہیں پہنچا رہی۔ آپ دیکھ لیجئے یہ بچہ بخار میں لہلہ رہا ہے۔ ہوا اس کے واسطے دھڑ ہے۔ آپ کی اجازت نہیں ہے تو کواڑ کھلو لیجئے۔ میں اس کو دیکھا کر ادھر منہ کر لوں گی۔"

زاہدا نے ہاتھ لگا کر دیکھا تو بچہ بخار میں لوثہ تھا۔ اور کھانسی اس شدت کی تھی کہ نیلا پڑا جاتا تھا۔

**تعلیم یافتہ**۔ "آپ اگر پڑھی لکھی ہوتیں تو آپ کو معلوم ہوتا کہ اس بچہ کی اس طرح کھانسی سے مجھ کو کس قدر تکلیف ہو رہی ہے۔ آپ اس کو بیمار کھتی ہیں۔ مگر اس کے کھانسنے کی آواز شیر سے کم نہیں۔"

**عورت**۔ "بی بی یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔ کہ میں کھانسی روک لوں۔ میں مجبور ہوں۔"

**تعلیم یافتہ**۔ "آپ باہر جائیے۔ دیکھئے وہ برابر کھانسی رہا ہے۔ اور یہ بچہ میں کسی خطرناک آواز نکل رہی ہے۔"

خانساں نے آواز دی کہ "چائے حاضر ہے۔"

**تعلیم یافتہ**۔ "لے آؤ۔"

خانساں اندر آیا۔ عورت اور زاہدا اُٹ کر کچے بیچھ گئیں۔ اور تعلیم یافتہ نے چائے بسکٹ اور انڈے کھا کر خانساں کو رخصت کیا اور عورت سے کہا۔ "آپ اس کو ایک انڈا اور دو سپون چائے دیکھئے۔"

**عورت۔** ”میرے پاس پیہ مطلق نہیں۔“

**تعلیم یافتہ۔** ”افسوس۔“

**زادہ۔** ”آپ نے خاندان کو اندر بلا لیا۔ حالانکہ آپ کو معلوم تھا کہ

یہاں دو پردہ کرنے والی عورتیں موجود ہیں۔ یہ مکہ پردہ نشین عورتوں کے

واسطے مخصوص ہے۔ آپ کو کوئی حق نہ تھا کہ آپ اس کو اندر بلا تیں۔“

**تعلیم یافتہ۔** ”آپ بھی مسلمان ہیں۔ اور میں بھی لیکن آپ پرانی عورتوں

کی طرح جاہل ہیں۔ اور اسلام کو مطلق نہیں سمجھتیں۔ میں اسلام کو آپ سے بہتر

سمجھتی ہوں۔ پردہ جس قدر ضروری ہے اور جو اسلام کا حکم ہے اس کے

خلاف کچھ نہیں ہوا۔“

**زادہ۔** ”مکن ہے کہ آپ اسلام کو ہم سے بہتر سمجھتی ہوں۔ مگر آپ

ہمارے جذبات کا خیال رکھنا ضروری تھا۔ کیا تعلیم کے یہ سنی ہیں کہ دوسروں کے

جذبات کا بیداری سے خون کر دیا جائے۔“

**تعلیم یافتہ۔** ”آپ نے پردہ کے اصول پر بھی کبھی توجہ کی۔ یہ آپ کا

پردہ پردہ نہیں۔ قید ہے جو شرع اسلام کے بالکل برخلاف ہے۔ ضرورت ہو

کہ آپ نہ سب کو سمجھ کر زندہ رہیں۔ ورنہ یہ زندگی فضول ہے۔ اگر آپ زیور تعلیم سے

آواستہ ہوتیں۔ اور قوم کا درد آپ کے دل میں ہوتا تو آپ کی زندگی سے مسلمان

فائدہ اٹھاتے۔ جس بُری طرح مردوں نے ہمارے حقوق پامال کئے ہیں اور ہم کو

انسان سے جانور بنا رکھا ہے۔ وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ہم آفرینان ہیں

اور اپنی ذلت کو اچھی طرح محسوس کر سکتے ہیں۔“

اوہ۔ اوہ کیسی سنت تکلیف اس لڑکے کی کھانسی سے ہوتی ہے۔

باہر ملو باہر جاؤ۔ تم لوگ اتنا نہیں سمجھتا کہ دوسروں کو تکلیف دینے کا نام کو



کہا حق ہے۔ اگر تم باہر نہیں جاتیں تو ہم تم کو زبردستی نکال دیگا۔ اوسا بھی تمہارا رپورٹ کرتا ہے۔“

**عورت**۔ ”بیوی ذرا باہر نکل کر تو دیکھو ہوا غضب ڈھا رہی ہے۔ اس پھول کو مار دے گی۔“

**تعلیم یافتہ**۔ ”پھول پھول مت بکو۔ یہ تم کو پھول ہے ہم کو نہیں۔ انسان کا بچہ ہے۔ ہوتا ہے مرنے سے۔ دوسروں کو اذیت مت دو۔ چلو۔ نہیں ہم ابھی رپورٹ کرتا ہے۔“

عورت نے بچہ کو سنبھالا اور تعلیم یافتہ بیوی کا منہ نکلتی ہوئی باہر آ بیٹھی۔ زاہرا یہ منظر دیکھ کر لرز گئی اور خود بھی برقع اوڑھ باہر چلی آئی۔ عورت کی حالت نہایت خراب تھی۔ بچہ نے اس کی آنکھوں میں دنیا اندھیر کر دی تھی۔ اس کے منہ کو نکلتی تھی، پیار کرتی تھی، روتی تھی اور بیتاب ہوتی تھی۔

زاہرا نے پوچھا:-

”یہ کب سے بیمار ہے۔ آپ اس کو کیا دوا دے رہی ہیں۔ اوسا آپ کو جانا کہاں ہے؟“

**عورت**۔ ”بیوی کیا بتاؤں۔ کیوں پوچھتی ہو۔ کیا فائدہ دنیا کے جھگڑے ہیں۔ چل رہے ہیں۔ جیسا تک زندہ ہوں چلتے رہیں گے۔“

**زاہرا**۔ ”آخر آپ بتائیے تو سہی بتائے میں کیا نقصان ہے؟“

**عورت**۔ ”میں شاید یہاں پور کی رہنے والی ہوں۔ وہیں بیباہی گئی میرے والد پہاڑ پر نوکر تھے۔ نہ لڑ میں ہمارا تمام مکان اور آدمی دب گئے۔ اور میرے ستر ماں باپ دونوں کا سایہ اٹھ گیا۔ ایک شخص سے جس کا نام بھول گئی ہم کو اگلا طلاق دی کہ میری ماں جان مرنے دفعہ زیور کی کے سپرد کر گئی ہیں۔ کسی معتبر آدمی کو

بھیج کر وہ منگو الو۔ کوئی صاحب مدرسہ میں احسان ہیں ان کی بیوی کے پاس امانت ہے۔ میرے میاں بیمار تھے۔ اور ہمارے پاس اتنا روپیہ بھی نہ تھا کہ اتنی دُور کا سفر کر سکیں کہ ان کی بیوی کی آٹا کا خط آیا۔ اور ہم پہاڑ روانہ ہو گئے۔ میاں بیمار تھے۔ پہاڑ پہنچ کر اور بھی مرض بڑھ گیا۔ اور پانچ روز میں چٹ پٹ ہو گئے۔

بیوی کس کس کو روؤں ماں باپ کو شوہر کو! میں کیلی پایہ دو برس کا مصمم پتہ پوچھ پوچھ احسان صاحب کی بیوی کے پاس پہنچی۔ اُنہوں نے وہ گالیاں دیں کہ خدا کی پناہ۔ اُن کے آبا مار نے کیلے دوڑے۔ اور گھر سے نکال دیا۔ سر لے میں ٹھہری ہوئی تھی۔ مسلمانوں نے شرارت میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا۔ ایک رات سرائے میں کاٹنی قیامت ہو گئی۔ اسی حالت میں دن نکلتے ہی وہاں سے بھاگی سرگڑ والے نے جو اسباب تھا وہ اپنے دامنوں میں چھین لیا۔ اب میرے پاس سوا اس ٹال کے جو میری گود میں ہے۔ یا ان کپڑوں کے جو بدن پہنیں اور کچھ نہیں ارادہ ہے کہ پاؤں پاؤں چلی جاؤں۔ بیوی اس بچہ کو کیا پوچھتی ہو بن باپ کا بچہ ہے۔ اگر اس کا باپ ہوتا تو وقت مجھ پر یہ مصیبت نہ ڈھاتا۔ اور میں اس کے واسطے ایک ایک پیسہ کے شربت کو نہ ترستی۔ یہ بن باپ کا بچہ بلے وارث کا ہے۔ جس کو تمہارے سامنے میرے ہی جیسی ایک عورت نے جو خود بھی اولاد والی ہو گی۔ کھانسنے کے جرم میں مسافر خانہ سے باہر نکال دیا۔ خدا کے واسطے بیوی! دیکھو تو سہی یہ کیسے سانس لے رہا ہے۔ اسے شکوہ میری گود پر دیں میں خالی نہ کیجیو! اے چاند آنکھ کھول! اے بیوی سنہ کھولے دیتا ہے لٹکا اپنے بچوں کا صدقہ! اپنے ہاتھ پاؤں کا طفیل! میرے کلیجہ کا ٹکڑا صرف اتنی دیر گود میں رکھ لو کہ میں بھیک مانگ کر اس کے واسطے تھوڑی سی چارے آؤں۔ اے بیوی

خدا کے واسطے بتاؤ اس کو کیا ہو رہا ہے؟

زاہدہ - ”آپ گھبرائیے نہیں خدا پر بھروسہ رکھئے۔ وہی فضل کرنے والا ہے۔ بچہ کو آپ خنوق سے میری گود میں دیدیجئے۔ آپ کو خود جانے کی ضرورت نہیں میں ابھی چائے منگواتی ہوں۔“

اتنا کہہ کر زاہدہ اٹھی اور احسان سے چائے کی پیالی اور ایک انڈا منگو کر بچہ کو دیا۔ بچہ اہل میں سردی ان گیا تھا۔ چائے پیتے ہی آنکھیں کھول دیں اور اس سے کہنے لگا۔

”بیوی بھوک“

قارون کی دولت روئے زمین کی سلطنت کوئی چیز ایسی نہ تھی جو ہر نصیب ماں کی نگاہ میں ان دو لفظوں سے زیادہ وقعت رکھتی۔ فرط محبت میں بیتاب ہو کر چٹ گئی۔ زاہدہ نے انڈا چھیلا اور بچہ کو دیا۔ اوپر تو چائے پی۔ اوپر کھایا انڈا، ادھر سے زاہدہ نے یہ ہشیاری کی کہ چاروں طرف سے رضائی سمیٹ کر خود ہوا کی طرف بیٹھی اور بچہ کو اچھی طرح دبکایا پسینہ آیا اور اس شدت سے کہ اس جاڑہ میں زاہدہ کے دانت سے دانت بچ رہے تھے۔ اس کی گود اور بچہ کے کپڑے سب چوڑا گئے۔ اب زاہدہ کی جان میں جان آگئی۔ اور عورت سے کہا:-

”آپ وہ خط مجھ کو دکھا سکتی ہیں۔ جو آپ کے پاس زیور کے سلسلے میں گیا تھا۔ عورت - ”جی ہاں یہ اوپر ہی رکھا ہے دیکھئے۔“

زاہدہ نے خط دیکھا تو اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ یہ منت کہا آپ وٹیں روز کے واسطے میرے ساتھ تشریف لے چلئے۔“

عورت - ”بیوی آپ کے احسان کا میں کسی طرح شکریہ ادا نہیں کر سکتی

آپ نے جو سلوک میرے ساتھ کیا اس کا اجر آپ کو خدا دیگا۔ میں نے اس سفر میں مسلمان مردوں کا جو تجربہ کیا خدا اس سے سب کو بچائے۔ آپ تو یہ دعا کیجئے کہ میں کسی طرح اپنے گھر پہنچ جاؤں۔ پھر انشاء اللہ گھر سے باہر قدم نہ رکھوں گی۔ روکھی روٹی اور پینے اچھے۔ اپنا کونہ بھلا اور آپ بھلے۔

زاہدہ۔ ”آپ کا یہ فرمانا نہایت درست ہے۔ مگر آپ مجھ پر بھروسہ کیجئے۔ میں آپ کو اپنی حقیقی بہن کی طرح رکھوں گی۔ آپ کی عزت اپنی عزت اور آپ کی تکلیف میری اپنی تکلیف ہے۔ میں اس کا شہر خدا کو کرتی ہوں کہ آپ کو دغا نہ دوں گی۔“

عورت۔ ”خدا سے زیادہ تو کوئی نہیں ہے۔ اور آپ کے احسانات نے مجھ کو دائمی گرویدہ کر لیا ہے۔ اگر آپ یقین دلاتی ہیں تو بہت اچھا۔ مگر میرے پاس کرایہ نہیں ہے۔“

زاہدہ۔ ”آپ اس کا خیال نہ کیجئے۔“

عورت۔ ”اتنا خیال رکھئے کہ میں ایک بد نصیب عورت ہوں۔ گو میرے سر سے وارث اٹھ گیا اور میں تنہا ہوں۔ مگر آپ کی نیت میں خرابی ہوئی تو میری جان کا اور اس بچے کا عذاب آپ کے سر ہوگا۔“

زاہدہ۔ ”آپ کیا فرما رہی ہیں۔ اور کیا سمجھ رہی ہیں۔ آپ مطمئن رہئیے۔ آپ کو دھوکا نہ ہوگا۔“

زاہدہ احسان اور عورت تینوں گھر پہنچے۔ عورت نے دروازے میں کھڑے ہو کر پہلے اپنا اطمینان کیا۔ عورتوں کے بولنے کی لڑکیوں کے کلام اللہ پڑھنے کی آواز سے دل ٹھٹھا کا تو اندر داخل ہوئی اور ایک کونہ میں چکی بیٹھ گئی۔

زاہدہ نے اس سے مفصل کیفیت بیان کی تو اس نے دیر بستی بلا کر اندر بیٹھایا اور بھائی کو جو شاہجہاں پور گئے تھے بلایا۔ انہوں نے بچہ کو پہچانا۔ خط موجود ہی تھا۔

زاہدہ نے چپکے سے زیور کی پوٹلی نکالی اور سامنے لا کر رکھی۔ عورت کی آنکھ سے خوشی کے مارے آنسو نکل پڑے۔ اور جب یہ الفاظ سنے کہ  
 ”بیوی معاف کرنا میں نے اطمینان کی وجہ سے یہ دہر لگائی۔“  
 تو دوڑ کر پیٹ گئی اور کہا:-

”میں آپ کے احسان جنتک زندہ ہوں فراموش نہیں کر سکتی۔“  
 زاہدہ:- ”یہ آپ کا کرم ہے میں نے درحقیقت آپ کو اسی واسطے تکلیف دی تھی۔ کیونکہ اہاں جان کا خط میں نے وہیں پہچان لیا تھا۔ اب یہ آپ کا گھر ہے جب تک جی چاہے شوق سے رہیے۔ اگر آپ جانا چاہیں تو میں نے ماموں جان کو رضامند کر لیا ہے۔ وہی آپ کے پاس گئے تھے۔ ضحیف العمر آدمی ہیں اطمینان سے پہنچا دیں گے۔“

عورت:- ”ہاں اگر اب گاڑی کا وقت ہو تو مجھے بھجوا دیجئے۔“  
 زاہدہ:- ”جی ہاں وہ اسی وقت کی گاڑی میں آپ کے پاس گئے تھے میں نے دریافت کیا تھا۔“  
 عورت:- ”بہت اچھا۔“

زاہدہ نے گاڑی منگوائی۔ جب عورت دروازہ میں پہنچی تو صاحب کا نے آکر مہمان کو گلے لگایا اور کہا:-

”یہ کھانا رکھ لیجئے رستہ میں کام آئے گا۔ یہ زیور اس بچہ کی تعلیم کی واسطے رکھیے اور اپنے اخراجات لستم لستم پورے کیجئے۔ یہ کچھ روپے ہیں۔ آئندہ پھر پہلی تاریخ کو جو کچھ میں بھیجوں اپنی عنایت سے قبول فرما کر مجھے ممنون فرمائیے۔“  
 گاڑی موجود تھی۔ عورت اپنے بچہ کو لیکر اندر بیٹھی۔ بڑے میاں باہر اور اس طرح زاہدہ اپنے مہمان کو رخصت کر بارامنت سے سبکدوش ہوئی۔

## اکیسواں باب

بے شمار پھول باغوں میں کھلے اور مرجھائے۔ لانا اور روہیں دنیا میں آئیں اور گئیں۔ آج ان پھولوں کا نشان اور ان زندگیوں کا پتہ دنیا کے حیات میں نہیں۔ پھول مرجھائے کو پیدا ہوئے، اور زندگیاں ناپید ہونے کو آئیں فنا ہونے والے پھول نہیں ہیں۔ ان کا سراغ نہ لگے۔ مگر ان کی دہکا رہی ہو اس موجودہ اور بدل کے بسے ہوئے پران کی زندگی کا نشان دے رہے ہیں۔ مرنے والوں کی ہڈیاں گلہ کر خاک ہو گئیں۔ ہوا ان کا غبار تاراج و برباد کر چکی۔ مگر ان کے کارنامے ابھی اس دنیا میں ہیں۔ اور جب تک دیکھنے والی آنکھیں موجود ہیں روشن رہیں گے۔ وقت اسلام کے درخشندہ جوہر خاک میں ملا چکا۔ اور وہ پاک نفوس جو اسلام کا بدل بالا کر گئے۔ خود زمین کی تہ میں اور ان کے نام آغوش تاریخ میں بے خبر پڑے۔ سوتے ہیں۔ بسا غنیمت تھی۔ انیسویں صدی عیسوی کے مغرب کی خوشنما پری کا جن صرف مردوں ہی کی آنکھیں سٹھر کر رہا تھا اور اسلام کے سدا بہار پھول گھروں کے چپے چپے پر دھک رہے تھے۔ مگر قیامت تھا۔ بیسویں صدی کا آغاز کہ یہ روایتی ہوئی گھروں کے اندر پہنچی اور مایہ ناز ہستیاں جو عدوت کی حیثیت میں مسافر اسلام کے نقش پا کا نشان دے رہی تھیں۔ شرابور ہو گئیں۔ لڑکیوں کی تعلیم جدید کا غلغلہ در و دیوار سے بلند اور ترقی قوم کی صدائیں دڑے دڑے سے اُونچی ہوئیں۔ کوشش محقول اور صد استحقاق تھی۔ کاش دائرہ مذہب کے اندر اور اصول اسلام سے وابستہ ہوتی۔ مگر زمانہ کی رفتار خیر آباد رہا تھیں لئے تھی اصول چن چن کر اور روایات چھانٹ چھانٹ کر بیچ کیں۔ آبائی جوہر پال اور ارکان مذہب دبا کر دیئے۔ لڑکیاں آزادی کی ہوا میں ترقی کے نعرے لگاتی مشرق پر لعن طعن کرتی مغرب

میدان میں اُتریں۔ مذہب کے جگمگاتے زیورات اُتار کر الگ پھینکے۔ اور آج وہ وقت ہے کہ جن گھروں میں صدائے ”اللہ اکبر“ کلیجہ دھلا دیتی تھی۔ اور گھر والوں کے سر مالکِ حقیقی کے حضور میں جھک جاتے تھے۔ وہاں مومن کی اذان گو ختی ہوئی جا کر اور موسیقی سے ٹکراتی ہوئی واپس ہوتی ہے۔

زمانہ اس رنگ کو بہت کچھ چمکا چکا۔ تعلیم جدید کی شہدائے ہونگی خاک نہیں۔ مگر سمجھیں گی کہ ہم تعلیم یافتہ اور برتری بوڑھیاں جاہل مطلق۔ مگر گمانِ غلط اور وہم لغو ہو گا۔ اگر ایمان کی روشنی دل میں موجود نہ ہو تو انھماں کی نظریں اونچی کر داور ان صورتوں کو دیکھ لو۔ جو اب کوئی دم کی مہمان ہیں۔ یہ سماں جلد بہت جلد اکٹھے اور جمل اور نظر سے چھپنے والا ہے۔ ترقی کے نعرے لگاتے ہوئے غول سرکوں پر کھائی دیں گے۔ مگر کہ لوں میں دیکھ کر ترقی کی دعائیں مانگنے والیاں زمین کا پیوند ہونگی۔ یہ وقت نہ ہو گا، اور یہ باتیں خواب و خیال ہو جائیں گی۔ مگر وہ دن آئے گا

اور ضرور آئے گا کہ مسلمان جس کو منزل مقصود سمجھ رہے ہیں وہ بیابانِ قیامت پھیر ہو گا۔ موجودہ تعلیم نسواں اس لئے کہ مذہب کا سان و گمان تک نہیں وہاں جان بوجھائی آسمان اس وقت بتا دے گا کہ وہ آن بان و ابیاں جو آج قبرستان کی زینت ہیں۔ لاریب مسلمان تھیں۔ جو ہر قدر امتِ مسٹ چکے اور اب سوا ایک آدھ گھر کے ان کا نام و نشان بکسا نہیں۔ مگر وقت آئے گا۔ آئے گا اور ضرور آئے گا کہ دنیا بے اسلام ان واقعات کو آنکھوں پر رکھے گی۔

بے غیرتی کی انتہا اور بے حدی کی حد تھی کہ یہ کچھ ہو گیا۔ مگر شاہنشاہِ برصغیر کے کان میں جو شیشیاں تہذیبِ جدید کی گھس چکی تھیں وہ نہ نکلیں۔ عزت گئی، آبرو گئی، باپ دادا کا نام و بابت بزرگوں کی ناک کٹی۔ اور اگر بیچ پوچھو تو صورت دکھانے کے قابل اور دینہ سامنے کرنے کے لائق رہی۔ مگر یہی ہوئی عادتیں چڑھے ہوئے رنگ اور پڑے

ہوئے پکے کسی طرح نہ چھوٹتے تھے۔ اور نہ چھوٹے۔ ماں کے بعد باپ نے یہ سمجھا اور سمجھا  
 کیا سمجھنا چاہیے تھا۔ کہ یہ جو کچھ ہے سب حسن کا جینے جی اس کا۔ مرے بعد اس کا۔  
 پھر میں نے کیوں چار دن کی زندگی کے لئے بُرائی سہلی۔ بیٹے ہوں کو بلا گھر بار چیز  
 علاقہ جائیداد سب سپرد کر دیے۔ بلانو پہلے ہی لیا تھا۔ مگر پورا قبضہ اب ہوا حسن  
 ٹھوکر کھا چکا تھا۔ اور ایسی کہ پہلے ہی حلقے میں تارے دکھائی دے گئے۔ مگر مغربی  
 تہذیب کی دلدادہ تعلیم یافتہ بیگم کے بھانویں بھی نہ تھا۔ روپے کی ریل پیل ہونے ہی  
 وہی بیوی تھیں۔ اور وہی کلب کے جلسے، آزادانہ تفریح، اور دورانہ سیر۔ بیوی کا  
 واقعہ حسن کو راہ راست پر لے آیا۔ اور نخوت و تکبر سب رد چکر ہوئی۔ خد کے سامنے  
 سر بھی جھکنے لگا، اور زبان بھی۔ جو شخص مسلمان سے سپردھے منہ بات کرنا کسر نشان  
 سمجھتا تھا وہ کوڑا دھتے جاڑوں میں صبح کی نازم غلسوں اور غریبوں کے برابر کھڑے ہو کر  
 جماعت سے پڑھتا۔ اب البتہ میاں بیوی کے مزاج میں زبردست اختلاف کی بنیاد  
 پڑی۔ میاں مغرب کا دشمن، اسلام کا شدید اجدت سے نفرت، شہرت سے دُشمن !  
 بیوی ترقی کی عاشق، مذہب سے دور، نام کی غلام، کام کی دشمن، احسن کو دقت نے  
 ٹھیک بنایا۔ اور حسن کا رنگ دیکھ کچھ تو صحبت کا اثر اور کچھ دکھائی دی موت۔ باپ  
 بھی اسی طرف ڈھلا۔ اب گھر میں ترقی کی حافظ اگر تھیں تو بی شاہلا۔

گلابی جاڑے تھے۔ رمضان کا مہینہ شروع ہوا۔ شاہلا کا رُک کا اسوقت  
 خاصا ماشا اللہ دس سال کا تھا۔ اور گورماں کی صحبت نے بھی اور تربیت نے  
 بھی اس کا ناس کرنے میں کمی نہ کی تھی۔ مگر باپ کی احتیاط اور احتیاط کیسا کوشش  
 نے اس کو فٹوڑا بہت مسلمان بنا دیا تھا۔ روزہ کی خبر شاہلا بہت زور سے سُنی ہی  
 تھی۔ اور سن رہی تھی۔ تیرہواں روزہ تھا کہ حسن نے ساس کو بلایا۔ اور اس کے  
 سامنے بیوی سے کہا:-



”کل منجھلا روزہ ہے۔ بچہ کو روزہ رکھوادو۔ آخر یہ بھی ہم پر فرض ہے۔ اس کو پورا کرنا ضروری ہے۔“

**شاہدہ۔** ”فرض کی خوب کہی۔ اس کا روزہ ہم پر فرض۔ یہ اس سے بھی تیز رہی۔ تعجب تم پر ہے کہ ایک ایسی یہ تمہاری عقل کو کیا ہو گیا کہ ان دھوکوسلوں کا کلمہ پڑھنے لگے۔ روزہ کی ضرورت اسلام کے ابتدائی دور میں بیشک تھی۔ اس لئے کہ مسلمان یوں بھی فاقہ مرتے تھے۔ روزہ کے لالچ نے ان کو ثواب عاقبت کی تقویت دیدی۔ مگر اب روزہ کو ضروری سمجھنا میری رائے میں غلطی ہے۔ جو کچھ ملائے کہتے ہیں اس کا ما حاصل یہ ہے کہ انسان فاقہ کی تکلیف محسوس کر سکے۔ چنانچہ ہر شخص کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی طرح ایک آدھ دقت کا فاقہ کر لیتا ہے۔ مگر اس کے معنی یہ نہیں کہ آدمی فاقہ کی اذیت محسوس کرنے کے بعد اپنا مال فاقہ کرنے والوں کے حوالے کر دے۔ یہ یقیناً اس رائے سے متفق نہیں ہوں کہ میرا بچہ محض تمہاری عقلمندی سے پھصبت بھگتے۔ علاوہ ازیں یہ روزہ کی شادی کیسی کہ تم یہاں جمع کرنے کی فکر کر رہے ہو۔ بہت سے کام ہیں جہاں روپیہ مناسب طور پر صرف ہو سکتا ہے۔ روپیہ اس واسطے نہیں ہے کہ اُٹھنے اگر مرے اڑائیں اور میرا بچہ روزہ کی مصیبت بھگتے۔“

**حسن۔** ”کس قدر افسوس ہے تمہاری عقل پر کہ تم نے بالکل ہی غریب کو کھو دیا۔ اور ایسے ایسے سخت کلمے تمہاری زبان سے نکلتے ہیں۔ تم اگر اپنے تئیں مسلمان کہتی ہو تو تم کو شرم آنی چاہیے کہ تم اسلام کی اس طرح اپنے منہ سے توہین کرو۔“

**شاہدہ۔** ”میں بیشک مسلمان ہوں۔ اور تم سے بہتر فرق اتنا ہے تم نے اسلام کو نہیں سمجھا میں نے سمجھ لیا۔“

**حسن۔** ”اگر تعلیم کا یہ ہی منشا رہے کہ آدمی غریب چھوڑ دے تو میں کہتا ہوں تعلیم گناہِ سخت گناہ۔“

**شاہدہ** - "اگر نازیب کے یہ ہی سنی ہیں جو تم سمجھ رہے ہو تو تم کو تمہارے نازیب کو تمہارے خدا کو سب کو سلام"۔

**حسن** - "اس قسم کی خوبائیں تم کو ایک دفعہ پورا مزہ چکھا چکی ہیں۔ اور ابھی تک نافرمانی اور خود رانی کی گفتگو کرتی ہو۔ تم کو جو سزا ملی وہ خدا کا غضب تھا جو تمہارے اوپر ٹوٹا۔"

**شاہدہ** - "مگر تم نے کیا قصور کیا تھا؟"

**حسن** - "چنے کے ساتھ گھن پس گیا۔ تمہاری وجہ سے میں بھی لپٹ میں آیا۔"

**شاہدہ** - "اور تمہاری ماں کی موت کون سے خدا کا عذاب تھا؟"

**حسن** - "وہ تو وقت سے مر میں اپنی عمر سے مر میں اپنے ٹھکانے پر مر میں۔"

**شاہدہ** - "مگر جاہل عورتوں کی عمر تو زیادہ ہوتی ہے۔ ان کی عمر ایسی تو نہ تھی۔"

**حسن** نے بیوی کے اس فقرے کا کچھ جواب نہ دیا۔ مگر اس کی طبیعت گڑبڑ

گئی۔ اس کو مری ہوئی ماں کے متعلق یہ الفاظ بہت ناگوار ہوئے۔ دو تین لمحہ خاموشی

رہی۔ اس کے بعد شاہدہ نے کہا:-

"اگر روزہ ضروری ہے تو یہ شادی کیا معنی رکھتی ہے۔ روپیہ صرف کرنا

کوئی قومی ضرورت نہیں ہے۔ ہم جو دن رات ان رسموں کو پیٹ رہے ہیں تو اسی

واسطے کہ مسلمان تباہ و برباد ہو چکے۔ اب ان کے پاس کچھ نہیں۔ ہاں یہ رسمیں باقی رہ

گئیں جو ہاتھ دھو کر ان کے پیچھے پڑی ہیں۔ اور جہالت کے کھلے ہوئے کرشمے ہیں۔

کون ایسا آنکھوں کا اندھا ہوگا جو اتنی بات نہ سمجھ سکے کہ جس قوم میں فلاس کی چاروں

طرف پیکار ہو رہی ہو۔ وہ ہزار ڈیڑھ ہزار روپیہ روزہ کی شادی پر اٹھارے۔ دسے

ہیں یتیم خانے ہیں، آئینیں ہیں ان کو دو نو قدم کو کچھ فائدہ پہنچے۔ مسلمان مصیبتوں سے

رہائی پائیں۔ نہ کہ یہ غصہ سب کہ روزہ کی شادی ہو۔ یہاں کھاتے پیتے آکر جمع ہوں۔ کوئی

برائی مانگے اور کوئی تنہا نہ کیا اس سے زیادہ کوئی گناہ ہوگا۔ اور اسکی باز پرس خدا کے ہاں نہوگی۔ یہاں جان برابر بیٹھی ہیں۔ اور خدا و رسولؐ کو جانتی اور پہچانتی ہیں۔ خدا کی بات سے ذرا مجھ کو جواب دیں۔ یہ بتائیں تم بتاؤ۔ ما شمار اللہ دونوں ایک سے ایک افضل ہیں۔ کوئی تو اس عقدے کو حل کر دے۔ یہ شادی اچھی یا قدم کی بربادی کا خیال اچھا؟

مال۔ ”تمہارا خیال بظاہر درست“ اور تمہاری رائے دیکھنے کو معقول اور ماننے کو نہایت اچھی ہے۔ اور ہم بھی اس رائے کی تائید اور اس خیال کی درستی سے متفق ہیں۔ بیشک ہیں اور ضرور ہیں۔ مگر تمہارے خیال میں کچھ بحث کی ضرورت اور غور سے اختلاف کی حاجت ہے۔ بشرطیکہ ناگوار نہ ہو، اور برائے مانو۔

ہم کو تم سے اس معاملہ میں اتفاق ہے کہ ان رسوم نے جو دوسروں سے لی گئیں یقیناً مسلمانوں کو تباہ کیا۔ بلکہ ہم یہاں تک کہنے کو تیار ہیں کہ عام طور پر مسلمانوں کا بڑا حصہ رسوم کی بدولت پریشان ہوا۔ مگر اس سلسلہ میں سب سے پہلے رسم کی نوعیت اور ادا کرنے والے کی حالت پر غور کرنا ہوگا۔ رسم مفلس سے واسطے حرمت اور مالدار کے لئے رحمت ثابت ہوگی۔ بشرطیکہ اعتدال سے آگے نہ بڑھے۔ انجنوں یتیموں، غریبوں، ابا بچوں کی خدمت سے کس کو انکار ہے۔ مگر سب پہا حق تو ہمارے اوپر ہمارے عزیزوں کا ہے۔ وہ عزیز جن کو روٹی کپڑا کچھ بھی میسر نہیں۔ تمہارے بیکے اور شسرال میں کسی کیسی دکھاری لڑائیں، کیسے کیسے یتیم معصوم بھرے پڑے ہیں۔ کیا تم کہہ سکتی ہو، تمہارے میاں بتا سکتے ہیں کہ رمضان بھر میں کتنی مرتبہ اپنے دسترخوان سے اٹھا کر درویشیاں ان کو کھیریں؟ جو ان لوکیاں، مسکینوں، غریب بچے فاقوں سے سوئیں، اور تنگے پھریں۔ کیا تمہارا دل بد نصیبوں کی مصیبت پر سہجیا؟ اور حاجتمندوں کی حاجت پر کڑھا؟ یہ دیوار بیچ فصیرا ڈیڑھ سال کی بیوی، رات بیتی ہے۔ ہماری آنکھوں کے سامنے رنڈا پا کاٹ دیا۔ اور ان میں قنیا۔

تمہارے میاں کی حقیقی خالہ زاد بہن ہے۔ مگر میں جانتی ہوں کہ تمہارے ٹکڑے کی شرمندہ نہیں۔ یہ رسم و حقیقت رسم نہیں ہے۔ ایک بہانہ ہے کہ تمام عزیز اقارب ایک جگہ جمع ہو کر ایک گھر میں بیٹھ کر ایک دسترخوان پر کھانا کھالیں۔ اور اس سلسلے میں امیر کے پیسے سے غریب بھی مستفیض ہو جائے۔ کیسی شادی اور کیسا جلسہ محبوب حقیقی کا شکر ہے کہ تو نے اس بچے کو اس قابل کیا کہ ہماری زندگی میں یہ تیرے حکم کی تعمیل کرتا ہے۔ اس سرست میں جو تو نے ہم کو عنایت کی۔ ہم تیرا شکر ہے اس طرح ادا کرتے ہیں کہ اپنے عزیزوں کو جو تیرا حکم ہے۔ تیرے حلقہ بندوں کو جو تیرا ارشاد ہے کھانا کھلا کر خوشی کرتے ہیں۔ تاکہ ان کے دُکھے ہوئے دل تسک پا کر دُعا کریں۔ تو قبول کرے اور ہمارے بچے کی عمر میں ترقی ہو۔ تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ ضرورت کے موقع پر دو۔ بیٹی کوئی خواہ مخواہ نہیں دیا کرتا۔ دیتے وہاں جتناں اپنا کام ہو یا نام۔ وہ دینے والے کہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ہو۔ قبروں میں جا سوئے۔ اب اگر ایسے موجود ہیں تو وہ دیں شوق سے دیں اس سے بہتر کام اور کیا ہوگا۔ مگر اس لئے کہ بیٹے کے روزہ کی شادی ہے محض اس مانتا ہیں ہر شخص خوشی خوشی روپیہ صرف کر دے گا۔

اسی واسطے یہ سلسلے بڑوں نے مقرر کر دئے۔ اور وہ بھی ان لوگوں کے واسطے جن کے پاس ہے۔ ان کے لئے نہیں کہ گھر میں نہیں کوڑی گئے والے ہوتے۔ قرض لیا نام کیا۔ بھیک مانگی، گروسی رکھا اور شادی بچا بیٹھے۔ ان کے واسطے تو یہ ثواب سخت عذاب ہے۔ وہ رسوم جن میں دوسری القربا کی تعمیل ہو بہلا ایمان۔ وہ رسوم جن میں غیا امیروں سے مستفید ہوں لاریب جائز۔ وہ رسوم جو ہماری روایات کو زندہ رکھیں، بلا شک درست، خدا نے اپنے فضل و کرم سے تم کو دیا ہے اور ضرورت سے زیادہ۔ یہ ہر تمہاری ملکیت نہیں۔ تم لاگ اپنا مال اور ہزار اپنی

چیز سمجھو۔ مگر اس میں دوسروں کے بھی حقوق اور سب سے بڑا حق، سب سے بڑا حصہ، اسی دینے والے کا ہے جو دینے کی قدرت رکھ کر لینے کی طاقت رکھ کر یتیم کی صورت میں یتیم کی ہیئت میں تمہارے دروازے پر آئے، تمہارے پڑوس میں ہے۔ تمہارے محلہ میں رہے، تمہاری دنیا میں بسے، کیا تم ایمان سے کہہ سکتی ہو کہ تم نے اپنی تمام عمر میں کبھی بھی اس نیت سے، اس خیال سے، اس ارادے سے کسی حاجتمند کی ضرورت کسی بد نصیب کی مصیبت کسی دکھیا رسی کا دکھ، دور کیا، پورا کیا، رفع کیا؟ نہیں ہرگز نہیں، کبھی نہیں، قطعی نہیں! پھر تم ہی بتاؤ کہ اگر اسی بہانے دولت نیک لگی، تمہارا بیڑا پار ہوا، تمہاری عاقبت سنو ہو گئی تو اچھا ہوا یا برا؟ میں ان لوگوں کی دشمن ہوں جو خود کسی قابل نہیں۔ مگر مصیبت میں پیش کر آفت میں گھر کر قرض لیکر رہیں ادا کریں۔ اور اسی طرح ان لوگوں کی بھی جو بالدار ہو کر دو ٹنٹہ بن کر روپیہ رکھ کر ضروری رسم سے بچیں اور روٹی کا ایک ٹکڑا، روپیہ کا ایک پیسہ، ٹھکان کا ایک چمچہڑا، خدا کی راہ پر نہ دیں۔ تمہارے یہ دونوں چھو کر سے تین سال سے تمہاری غلامی کر رہے ہیں۔ یہ آج بن ماں کے سہی، بن باپ کے سہی۔ مگر کبھی کلیجہ سے ٹکڑے اور آنکھوں کی ٹھنڈک بھی نہ تھے۔ اسوقت وہ آنکھیں بنا اور وہ کلیجہ موجود نہ ہوں۔ مگر یہ مسلمانوں کا اولاد میں تم بنا سکتی ہو کہ اس عرصہ میں تم نے کتنی مرتبہ ان کو کلیجہ سے لگایا اور کتنے دفعہ گھر کا جھڑکا۔ ڈانٹا پیٹا۔ کیا یہ صرف اسی سے پیدا ہوئے تھے کہ مائی محبت اور باپ کی شفقت سے محروم ہو کر درد کی ٹھوکریں کھائیں؟ کیا انکی عمر اس قابل نہ تھی کہ تم ان کو تعلیم دیتیں۔ اور یہ پڑھ لکھ کر کسی قابل ہوتے؟ ان کی صورت اگر آنکھیں ہوں، ان کی حالت اگر کان ہوں، کچھ دکھاتی ہے، کچھ سناتی ہے، عقل ہو تو کچھ بتاتی ہے۔ اور ایمان ہو تو کچھ طلب کرتی ہے۔ یہ تمہارے کلمہ کے شریک، تمہارے مذہب کے ساتھی، اور تمہاری قوم کے بچے ہیں۔ جو روکھے ٹکڑے کھا کر اونچے پیچھے پہن کر زندگی بسر کر رہے ہیں۔

انہوں نے زبان سے نہیں، اپنی حرکات سے، انہوں نے منہ سے نہیں اشارت سے، اپنی کھانم کو بتائی، اپنی مصیبت تم کو بتائی، مگر تمہارا دل نہ پیچا، لیکن اس روزہ کے طفیل تمہارے بچہ کی بدولت اور اس رسم کے صدقہ میں ان کا تن ڈھکے گا اور ان کا پیٹ بھرے گا۔

حسن میاں بچہ کو روزہ رکھواؤ۔ اور گرگڑا کر مجھ کو حقیقی سے التجا کرو کہ وہ اس کی بہار تم کو دیکھنی نصیب کرے۔ اس کی عمر میں برکت دے اور اس کا صدقہ ملے نہ دکھائے۔ محتاجوں کو کپڑے پہناؤ۔ بھوکوں کو کھانا کھلاؤ۔ روؤ اور گرگڑاؤ کہ اے حاکم حقیقی میری التجا سن۔ اور جو بچہ آج روزے کا دوہا ہے۔ اس کو دوا سن کا دوہا بتنا نصیب ہو۔

## پانچ سوواں باب

شہر کی ہیکاری کا زاہد کا کے دل پر ایسا کاری زخم اور گہرا صدمہ تھا کہ گویا پکی طرف سے کم اور ماں کی طرف سے کافی۔ ساس کی طرف سے تھوڑی اور خسر کی طرف سے مستول بدو اس کو بل رہی تھی۔ مگر وہ رعایت مصیبت اور سلوک غلبہ سمجھتی تھی۔ مجبور لیتی، اور لاچار صرف کرتی۔ مگر دو چار دفعہ نہیں یہ اس نے بار بار کہا کہ ”میاں کی کمائی کا ایک پیسہ اس ڈھیر سے اور سوکھی روٹی اس قورمہ سے فضل اور بہتر۔“ بیوی کا خیال کسی کیسی ذریعہ سے میاں کے کان تک پہنچتا اور یہ کچھ نہیں کہ اس سے متاثر نہ ہوتا۔ اس کی خود رائے یہ ہی تھی۔ اور اچھی طرح سمجھتا کہ بڑھے ہاتھ اور امیر خسر کی کمائی میں خواہ مخواہ سا بچھا لڑانا انتہائے بے حسیتی ہے۔ مگر کرنا کیا ہون دن بھر مار مارا پھرا، رات بھر نمازیں پڑھیں، مگر روزگار نہ ملا، احسان کی وہ شبیں شاں اور مطلق سبب پہاڑی تک تھی۔ گھر اگر ادھر تو روپیہ کا ٹوٹا، ادھر دوستوں

کے کچوکے، اور سب سے بڑی مصیبت پریشانی، غرض وہ صاحبیت تو پہاڑ سے چلتے ہی چلتے کم ہو گئی رستہ میں اور بھی جھو جھری ہوئی۔ اور گھر پہنچ کر تو وہی کوہِ احسان تھا۔ مصیبت وہ انکس ہے کہ بڑے بڑے سرکشوں کی گردنیں مڑوڑ کر نیچے جھکا دیں۔ احسان تو کس گنتی میں تھا دو چار دن تو ذرا اکڑا رہا۔ مگر پھر جو جھکا تو یہ حال تھا کہ کسی وقت کی نماز ناغہ نہ کرے۔ زانہا پہلے ہی وظیفہ اور تسبیح کی اتنی دلدراہ تھی کہ بچپن ہی میں کنبہ بھر حجن کنبہ تھا۔ اور اب تو یہ حال تھا کہ حصن حصین کا تہم یا غفور کی تسبیح یا کریم کا وظیفہ دن رات تھا۔ پہر حال میاں بیوی کی التجا کا اثر تھا یا صرف میاں کی کوشش کا نتیجہ۔ احسان کو ایک جگہ ملی اور اچھی ملی۔ ہم اس موقع پر زانہ کی طرف جس قدر کریں وہ کم۔ اس نے پہلی تنخواہ ہاتھ میں آتے ہی غراب کو کھانا کھلایا اور تمام عزیز اقارب کو جمع کیا، مولود شریف پر لٹھا۔ اس سلسلہ میں وہ دونوں بھوپھی بھتیجیاں رحیم اور منیرن جو شاہراہ کے ہاتھوں حوالات میں پہنچی تھیں جس وقت آئی ہیں اور زانہ کو مہانوں کے چھوڑا ہوا رحیم کو لینے گئی ہے تو ہر تنفس اس کا مارچ تھا۔

ذکر ولادت کے بعد زانہ نے یہ تقریر کی :-

”بزرگ ماؤں اور عزیز بہنو! آپ نے حضور اکرمؐ کے حالات سن لئے اور دیکھ لیا کہ وہ ذات پاک جو غریبوں کا لجا اور یتیموں کا ماویٰ ہے کس طرح دنیا میں رہی۔ اور کیا فکر یہاں سے رخصت ہوئی۔ اس پاک زندگی کا ہر واقعہ اور واقعات کا ہر حصہ ہم کو اسلام کے معنی بتا رہا ہے۔ سرورِ عالمؐ کے بعد خلفائے راشدین کا دور ہم سے آواز بلند کہہ رہا ہے کہ مسلمانوں نے ہمیشہ مار پیس کو سناٹھ لیکر دنیا میں ترقی کی۔ تاریخ سے بڑا شاہد کون ہو گا جس نے ہم کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ اسلام کی منحوس گھڑی وہ تھی جب

مسلمان مذہب سے علیحدہ ہوئے۔ مصیبت کی گھٹائیں اسی وقت سرول پر چھائیں۔ افلاس سکے پٹے اسی حالت میں تیز اور وقت کے پہاڑ اسی وقت چاروں طرف سے نمودار ہوئے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ہم جو علوم و فنون میں اپنا مثل نہ رکھتے تھے۔ جاہل مطلق بن گئے۔ خدا غریقِ رحمت کرے مگر ہمیں کو کہ انہوں نے بد نصیبی تو ہم کی جو عرصہ حیات میں دم توڑ رہی تھی۔ نبض دیکھی۔ اور مرض پہچانا، تشنہ لکھا، اور دوا دی۔ ہم اپنے عروج کو تو کیا پہنچتے۔ مگر خیرنا سے ہاں ہو گئی۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس جدوجہد کا نتیجہ حسب توقع خوشگوار نہ نکلا اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مذہب کا لحاظ کامل طور پر کیا گیا۔ وہ تجویزیں ختم، وہ کوششیں پوری اور وہ منصوبے مکمل ہو چکے۔ اور جن دماغوں میں عقل، جن آنکھوں میں روشنی اور جن دلوں میں ایمان موجود ہے ان کو اس امر کا اعتراف ہے کہ اندھی تقلید اور دوریِ مذہب جو بربادی کا پیش خیمہ تھی ستیا ناس کر دیا۔ اب ہمارے سامنے تعلیم نسواں کا مسئلہ ہے۔ اور یہ کہنا کہ مسلمان اس کی اہمیت کو سمجھ گئے غلط ہے۔ آپ کو تعجب ہوگا۔ اگر میں یہ کہوں کہ مسلمانوں پر یہ حکم ہے کہ وہ تعلیم نسواں کے مخالف تھے۔ مسلمانوں نے تعلیم کے متعلق حضور اکرمؐ کے ارشاد کو ہمیشہ سرائے سمجھا۔ مگر انہوں نے اس تعلیم کو جو آجکل دی جا رہی ہے۔ تعلیم نہ سمجھا انہوں نے یہ جان نہ خیال نہ کیا کہ اپنی لڑکیوں کو جن کے جوہر عصمت کے معاملہ میں وہ دنیا کی ہر شے کو بیچ سمجھتے تھے اپنی آنکھ سے ایک لمحہ بھر کے لئے اوجھل کر دیں آج کی دنیا اس کو غلط کہہ دے مگر خیال



یقینی مقبول اور فیصلہ بلا شک صحیح تھا۔ وقت نے ان کو عاجز اور ضرورت نے ان کو لاچار اور زمانہ نے ان کو مجبور کیا۔ دولت ان سے گئی، حکومت ان سے چھٹی، سلطنت ان سے گئی۔ اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ اگر ان کو دنیا میں زندہ رہنا ہے۔ تو اپنے گھروں میں بیٹھ کر اپنے کونوں میں دبک کر اپنے کھنڈلوں میں مسکڑ کر اپنی آبرو کو دونوں ہاتھوں سے بنائیں، بڑوں کی عزت کو کلیجہ سے لگائے خاموش بیٹھیں، اور اپنا بھم بھیں دولت نہ تھی، عزت تھی راج نہ تھا، لاج تھی۔ حکومت نہ تھی، غیرت تھی۔ سرگئے۔ گراں نہ بگڑنے دی۔ دولت مند بنو! ان کو اپنے نقطہ نظر سے نہ دیکھو۔ تم آٹھ سیر کے آئے، اور آدھ سیر کے گھی میں گن ہو وہ غریب ۲۰ سیر کے آئے اور ڈیڑھ سیر کے گھی میں بھی شکل سے پیٹ بھرتے تھے۔ تم پھر اپنی ذات کے حقوق ہیں۔ ان بے نصیبوں پر غیروں کے بھی تھے۔ تم کھا کر مطمئن اور پہن کر خوش ہوتی ہو تو وہ کھلا کر خوش اور پہن کر بدلتا ہوا ہوتا ہے۔ میں ایسی خوش نصیب نہیں ہوں کہ وہ صورتیں اپنی آنکھ سے دیکھتی۔ مگر ان کے ہر سانس میں ہیں۔ اور ان کے کھڑوں کے دیکھنے کو ترستی ہوں۔ کیا تم اس سفید ڈاڑھی کو قابلِ رحم اور اس پیشانی کو جو گھنٹوں سجدے میں رہی ہو لائق ہمدردی نہیں سمجھتیں جس کا منظر میں تم کو دکھائی ہوں۔

نماز مغرب سے فراغت پا کر بڑے میاں لکڑی ٹیکتے ہوئے بیوہ پر دس دن کے گھر پہنچے اور پوچھا :-

”بیٹی تیل منگو لیا؟“

**بیوہ** - "جی نہیں آپ ہی کی راہ دیکھ رہی تھی۔ ننھا بھی بخاریں  
لو تھ ہے۔ دھیلے کا تیل اور دھیلے کا شربت بنفشہ لا دیجئے۔"  
ایک ہاتھ میں ٹوٹی بوتل دوسرے میں پچکا کٹورا۔ تیل لائے شربت  
لائے۔ بیوہ نے کہا:۔

"اے سہ نانا میں تو بھول گئی ایک پیسہ کے اوپے بھی لا دیجئے۔"  
**برٹے میاں** - "اچھا بیٹا لاؤ۔"

رات کا وقت 'سرک پر اندھیرا' بخل میں بیوہ۔ ٹھوکر کھائی گرے  
اور اٹھے چاروں طرف ٹیول کر اوپے سمیٹے۔ ایمان زبان سے کہتے  
ہوئے لرزتا ہے۔ اور تمہارے نازک دل پہ سنکر کانپ جائیں گے  
کہ برٹے میاں نے اس اندھیرے میں اس خیال سے کہ بیوہ کے مال کا  
قیامت کے روز مجھ سے مواخذہ نہ ہو۔ ایک ایک کرسی ڈھونڈ ڈھونڈ کر  
چُنی اور لے کر آئے تو بیوہ نے اوپے لیکر کہا "مکان دار آیا ننھا۔ کراہ کا  
روپیہ میرے پاس کھا ہی میں نے اس وقت بات نہیں کی۔ یہ دیتے جائیے۔"  
**برٹے میاں** - "تم نے بہت اچھا کیا۔ لاؤ میں دیدوں گا جو  
عورت کا غیر مرد سے بات کرنا کیسا۔ بیٹی ہم نے ایک دفعہ مولانا سے  
یہ سنا تھا کہ کسی موقع پر حضرت ابی بکرؓ اور بنی بنی عائشہؓ  
دونوں باپ بہنیاں باتیں کر رہے تھے۔ کہ رسول اللہ تشریف لے  
آئے۔ اور آپ نے اس تنہائی کو پسند نہ فرمایا۔ بھلا خیال تو کو مصدقؓ  
جیسا باپ اور صدیقہؓ جیسی بیٹی کہ بیٹی بھی اور مسلمانوں کی ماں بھی۔  
جب یہ صورت ہو تو ہم جیسے گنہگار کس گنتی میں۔ بیٹی جہاں دو آدمی  
ہوتے ہیں وہاں تیسرا شیطان ضرور ہوتا ہے۔ اور تمہارے حالات کا

تقاضا یہی تھا۔ تم نے بہت اچھا کیا کہ اُس سے بات نہ کی اس کو نہ  
 میں ٹیٹھی اللہ اللہ کرتی رہو۔ خدا عزت اُپر سے اٹھائے تو سب کچھ بھر پایا۔  
 میری بہنوئی میں تم سے بحث نہیں کرتی۔ میں جانتی ہوں کہ وقت تمہارا  
 ساتھ ہو۔ تم جو کچھ بھی کہو گی وہ صحیح۔ اور میں جو کچھ بھی کروں گی وہ غلط۔  
 مگر تمہارے ایمان پر فیصلہ چھوڑتی ہوں۔ کیا بڑے میاں کی یہ رائے  
 غلط تھی کہ عورت کی عصمت پر تمام خاندان کی عزت  
 کا انحصار ہے۔ اگر نہیں تھی اور ان کا خیال درست تھا تو کیا وہ یہ  
 کر سکتے تھے کہ اپنی جوان بیٹیوں کو کسی ضرورت سے بھی آنکھ کو دھو کر دیں۔  
 تمہارا دعویٰ اب شاید اور بھی مضبوط ہو جائے۔ اور تم کہہ سکو کہ  
 عصمت لٹتی تھوڑی پھر رہی۔۔۔ کیا ڈاکے پر پڑے ہیں کہ لڑکیوں کو  
 قید کر دو۔ بہنوں تم اس کو قید نہ کہو۔ یہ صرف احتیاط تھی۔ اپنا واسطے  
 نہیں لڑکیوں کو واسطے کہ وہ ہر بلا سے محفوظ اور ہر آفت سے بچی رہیں۔  
 میں خود کہتی ہوں کہ ڈاکہ نہیں پڑ رہا۔ اور خدا نخواستہ تم سے بھی بڑی ٹیٹھی  
 کوئی وجہ نہیں ظنوا المؤمنین خیراً میرا ایمان ہے۔ لیکن امکان  
 پر غور کرو آخر پچھلے ہی مہینہ کا واقعہ مشن کالے لوہے کی طرح ماں  
 باپ چیتے اور پیٹھے پھرے۔ بڑھے باپ نے کیا کیا نہ کیا اور اس  
 بڑھاپے نے اس کو کیا کیا نہ دکھایا۔ چھوٹی آنکھ کا دیدہ، عمر بھر کی کئی  
 ایک بچی اور وہ آنکھوں کے سامنے غیروں کے پھندے ہیں پھنس جائے  
 پڑیسیا باپ پر کیا گزری وہی بتا سکتا ہے۔ رسول کے آگے ہاتھ  
 اس نے جوڑے۔ عدالت کے پاؤں میں سر اُس نے رکھا۔ بیٹی کی  
 منت خوشامد اس نے کی۔ مگر خاک اتر نہ ہوا۔ جوان تھی کھلم کھلا بیسیا

ہوئی۔ اور وہی نکتہ چار جس کو سارا محلہ جانتا تھا عیسائی ہو کر اس کا  
 شوہر بنا۔ قاضی اور ملا، کچہری اور عدالت کوئی بھی کچھ نہ کر سکا کہ لڑکی اپنی  
 مرضی کی مختار ہے۔ میں تم سے پوچھتی ہوں کہ اگر وہاں باپ مشن میں آزادانہ  
 نہ بھیجتے تو یہ دن بیوں دیکھنا نصیب ہوتا۔ اس سے نہیں انکار  
 نہیں اور ہو سکتا بھی نہیں کہ مشن سکولوں کی تعلیم میں اندیشے کا  
 امکان ہے۔ ایسی حالت میں وہ لوگ قیمتی سے چونکہ عصمت کو  
 عورت کا سب سے بڑا جوہر سمجھتے تھے۔ انہوں نے موجودہ ذرائع تعلیم  
 قابل اطمینان نہ سمجھے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا گیا کہ وہ تعلیم نسواں کے  
 مخالف ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ نہیں۔ بلکہ اصلیت وہ احتیاط ہے  
 جو میں نے بیان کی۔ اب تم کو پھر ایک بات کہنے کا موقع ملتا ہے کہ  
 حصول علم اسلام کا مسئلہ فیصلہ ہے۔ جس میں مرد کی تخصیص نہ عورت  
 کی انہوں نے محض اپنے دہم پر عورت کی تمام زندگی قربان کر دی۔  
 اور اس کو جاہل رکھ کر قوم کو وہ نقصان پہنچایا۔ جس کی تلافی صدیاں  
 بھی مشکل سے کریں گی۔

مجھے اعتراض کے پہلے حصے سے اتفاق ہے۔ اور میں اعتراف کرتی  
 ہوں کہ تحصیل علم کی کوشش اسلام کا فیصلہ قطعی ہے۔ مگر میں  
 اس کے ساتھ اتنا ضرور کہوں گی کہ اسی وقت تک اسی حال میں  
 اور اسی صورت میں کہ ہمارے مذہب پر آنچ نہ آئے۔ جب ہمارے  
 مذہب پر زہرت آئی تو ہم وہ لوگ ہیں کہ علم کیا تو بہ تو بہ نحو ذوالعہد....  
 خیر میں کچھ اور تو نہیں کہتی۔ اپنی زندگیوں تک کو قربان کر دیں۔  
 مسلمانوں نے اگر تعلیم نسواں کو مذہب پر قربان کیا تو کیا گناہ کیا۔ وہ

دیکھتے تھے کہ مسلمانوں کے اتنے مدرسے موجود نہیں، اتنی  
 اُستادیاں میسر نہیں، اتنے انتظام ممکن نہیں، وہ سنتے تھے  
 کہ مشن کی پڑھنے والیاں اذان کے وقت انجیل کے سبق رٹ  
 رہی ہیں۔ وہ دیکھتے تھے، اور سنتے تھے، وہ جانتے تھے ان کو  
 معلوم تھا کہ مؤذن کے الفاظ ہوا میں گونج رہے ہیں۔ اور  
 نیند کے متوالوں کو جگا جگا کر حق کی طرف بلا رہے ہیں مگر کواری  
 بچیاں جہان اور ہوشیار تکبیہ کے نیچے سے انجیل نکال کر جھپٹ  
 حفظ کر رہی ہیں۔

وہ جانتے تھے کہ یہ ان مرنے والوں کی بچیاں ہیں جن کے کچے  
 پیغام حق دہلا دیتا تھا کلمہ پڑھ کر اُٹھ بیٹھتی تھیں۔ اور کرکڑا تے  
 جائزوں میں وضو کر کے سجدوں میں گر گڑا، گر گڑا کر حکم الحاکمین کی  
 وحدانیت کا اعتراف کرتی تھیں۔

میری بچیو! کواری بیٹی کو دلہن بنا کر پالکی میں بٹھا دو۔ دوا کر دو  
 میت کو نہلا دھلا چار پائی پر لٹا کر رخصت کر دو۔ مگر دواغ مذہب  
 آسان کام نہیں۔ جو لوگ اس کو جدا کر رہے ہیں۔ ان کو محاذِ نہر  
 نگران کی حالت پر بھی روئے والی آنکھیں دنیا میں موجود ہیں۔ یہ  
 دو چیزیں عصمت اور مذہب مسلمانوں کے سامنے تھیں۔ اور ہیں۔  
 ترازو کا ایک پلڑا یہ تھا اور دوسرا تعلیم نسواں۔ واقعات تمہارے  
 سامنے ہیں۔ ترازو اپنے ہاتھ میں ہے۔ لو اور بتا دو کہ کدھر کا پلڑا  
 وزنی ہے۔ اور بڑے میاں کیا کریں۔

یہ میں نے منوا دیا۔ مگر واقعہ جو تم سمجھ رہی ہو وہ نہیں انہوں نے

تعلیم نسواں کو ہرگز نہیں چھوڑا۔ وہ صرف اسی تعلیم کے مخالف تھے جو ان کے اصولوں سے علیحدہ تھی۔ وہ پڑھاتے تھے لکھاتے تھے اور بتاتے تھے کہ دنیا میں کیونکر رہنا اور کیا کرنا ہے۔ میری بہنو! ان کا ہر گھر کتب اور ہر محلہ مدرسہ تھا۔ یہ مبالغہ نہیں ہر پڑھی لکھی عورت کا فرض تھا کہ محلہ کے بچوں کو پڑھائے۔ اب وہ سماں نہ رہا مگر اسکے دیکھنے والے موجود ہیں کہ چھوٹی چھوٹی بچیاں بغل میں تکیہ اور پارے لئے علی الصبح استنانی کے یہاں پہنچ گئیں۔ یہ اپنا ہی محلہ اور دیوار بچ گھر ہے۔ مائیں آ اور جا رہی ہیں، دیکھ اور بھال رہی ہیں کہ تعلیم کیوں کر ہو رہی ہے۔ پڑھنا، لکھنا، سینا پر دنا، کھانا پکانا، آج میر نہیں آسکتا وہاں باتوں باتوں میں حاصل ہوتا تھا۔ تم مشکل سے اور شاید دس پانچ منٹ میں کاغذ اور قلم پینسل اور سیٹ پر لکھ کر بتاؤ گی مگر وہ تمہارے سامنے زبانی حساب کر کے بتا دیں گی کہ دو روپے ساڑھے چھ آنے گز کا کپڑا ایک گز ساڑھے سات گرہ کتنے کا ہوا۔ تم کو سوچنا پڑے گا کہ ہونے چودہ چھٹانک کا گھی سات پیسے کا کتنا ہوا۔ مگر وہ چٹکی بجاتے ہی بتا دیں گی۔ اگر تم کو تعجب ہو تو میری مانی ماں بھی ہیں ان کا امتحان لے لو۔

تو بہنو! انہوں نے ہرگز ہرگز تعلیم نسواں کو ہاتھ سے نہ دیا۔ تعلیم دی اور وہ تعلیم جو اسلام کا عین منشا تھا۔ خیالات پیش نہ دئے۔ مذہب کو مقدم رکھ کر ہر ضرورت کو اس کے تحت میں سمجھا۔ اب بھی مسلمان لڑکیوں کو تعلیم دے رہے ہیں۔ اور پہلے بھی دیتے تھے۔ مگر اس طرح کہ مذہب ہاتھ سے نہ جائے مسلمان بیبیوں کا

وہ فریق یا مردوں کا وہ گروہ جو تعلیم جدید کو مقدم سمجھ رہا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ زمانہ کی رفتار اس کے ساتھ ہے۔ وہ جو کہے درست مگر حق یہ ہے کہ ان کو علم صرف اتنا ہی حاصل ہوگا کہ ٹوٹا پھوٹا خط لکھ لیں۔ یا اعلیٰ لباس پہن کر تفریح کر لیں۔ بہت تیرا تیرا تو کسی شہر کا نام انگریزی میں لکھ لیا۔ مگر یہ جو کچھ اس طریقہ تعلیم سے (مشن سکولوں میں پڑھنے سے) حاصل ہوگا اس زبردست قربانی کے بعد جس کا نام مذہب ہے۔

تقریر ختم کرتے ہی زاہد آگے بڑھی۔ ایک کشتی اٹھائی جس میں دو نئے جوڑے اور کچھ روپے تھے رحیم کے پاس آئی اور کہا:-  
"میں ہاتھ جوڑ کر کہتی ہوں کہ خدا را شناہوں یا یہ نصیب کا قصور سنا کیجئے۔ یہ صرف آپ کی آہ کا اثر ہے کہ وہ سمجھت آج تک نہ پہنچی۔  
رحیم نے زاہد کو گلے لگا لیا اور کہا:-

میں ایک معمولی ماں ہوں۔ اس قابل نہیں کہ آپ مجھ کو اس طرح شرمندہ کریں۔ بچی خدا تیری عمر دے کرے۔ تیرا گھر آباد اور تیری ما کا کلیجہ ٹھنڈا رکھے۔ چھوٹی بیوی کا نام میرے سامنے نہ لو۔ میری آبرو ان کی بدولت غارت ہو چکی۔ اور آج تک میری بچی کو بڑبڑا۔ میں جیل خانہ پہنچی اور حوالات میں ہی۔ بیوی اس سے زیادہ مصیبت کیا ہوگی۔ رات کے وقت میری کواری بچی میری آنکھ سے اچھل ہوئی۔ میں اپنا کلیجہ مسس کر رہ گئی۔ وہ طاقتور ہیں، امیر ہیں، پڑھی لکھی ہیں۔ میں بچاری کمزور ہوں، غریب ہوں، بدلے کے لائق نہیں۔ مگر جس کے آگے پانچ وقت سر جھکاؤ ہوں۔ وہ شاہنشاہ بیوی سے زیادہ طاقتور ہے۔ میرا بدلہ ضرور لے گا۔"

اتنا کہہ کر رحیم کی طبیعت بگڑ گئی۔ اس کی آنکھ سے آنسو نکل پڑے۔ کھڑی ہو گئی

ہر چند سب نے روکا۔ مگر اس کی حالت ایسی خراب ہوئی کہ وہ نہ ٹھہری اور چل دی۔  
شام کے وقت وہاں اپنے اپنے گھر رخصت ہوئے۔ دوسرے روز صبح کے  
وقت جب زاہد کا میاں کو کھانا کھلا چکی تو پندرہ روپے دئے اور کہا:-  
”آج ہی وہیں بیگم کو روانہ کر دو۔“

احسان - ”نہیں، ہرگز نہیں۔“

زاہد - ”نہیں یہ فیصلہ غلط ہے۔ وہ نکاح میں ہیں اور ان کی خبر گیری  
تمہارا فرض ہے۔ دنیا کے دھندے چل رہے ہیں، چلے جائیں گے۔ مگر خدا کے  
ہاں بوجھ اپنے سر پر نہ رکھو۔“

احسان بیوی کی انسانیت کا معترف پہاڑ پر ہوجکا تھا۔ یہاں پہنچ کر جب یہ  
دیکھا کہ زاہد ملازمت سے زیادہ بیکاری میں فرمانبردار نکلی تو اس کا کلمہ پڑھنے لگا۔  
اس وقت زاہد کا نے یہ تقریر کی تو ان تمام مظالم کی تصویر جو احسان نے پہاڑ پر ٹوڑ  
آنکھ کے سامنے پھر گئی۔ اور اُس نے سوچا کہ انتہائے انسانیت ہے اور صرف  
جوہرِ قدرا مت کہ جس شقی القلبِ عورت کے ہاتھوں اس غریب پر یہ کچھ گزر گئی  
چو رہی۔ مگر ٹھہری۔ گھر چھوڑا۔ بار چھوڑا۔ اس وقت بھی اس کی سفارش کر رہی ہو۔  
یہ خیال آتے ہی میاں ختم احسان چنچ اٹھا کہ ”بیشک زندگی تم ہی جیسی بیویوں سے  
سنو سکتی ہے۔ جنہوں نے انسانی ہئیت میں شوہروں کو جنت کا نمونہ دکھایا۔“

احسان کی حالت کا انقلاب عارضی تھا۔ جو بیوی نے چند ہی روز میں درست  
کر دیا۔ اور وہ شخص جو پہاڑ پر صرف دنیا ہی کو زندگی سمجھتا تھا بیوی کے طفیل متاثر ہو گیا  
ہوا کہ گھر سے دفتر تک جاتا تو درود شریف پڑھتا ہوا۔ دل میں خلوص اور نیت نیک  
تھی۔ خدا کی رحمت نازل ہوئی۔ اور کچھ دن پہلے وہ موت نہ گزری تھی کہ احسان تنہا  
روپے ماہوار پر پہنچ گیا۔



## تیسواں باب

سنا ہے کہ مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی۔ حسن جیسا عاشق زار شوہر اور غمخوار رفیق جو قدموں کے نیچے آنکھیں بچھاتا شاہن سے ایسا بیزار ہوا کہ صورت نہ معلوم ہونے لگی۔ بچہ جو آنکھوں کا تارا، اور کلیجے کا ٹکڑا تھا غیروں کی مانند لگ تھلگ تڑا اور دشمنوں کی طرح گھورتا۔ باپ جو صورت کا عاشق اور نام کا دیوانہ تھا مہینوں آکر نہ بھانکتا۔ حسن شروع شروع تو بیوی سے دو قدم آگے ہی تھا۔ اگر وہ ترقی کی دلدل دہتی تو یہ پردے کا دشمن۔ مگر واقعات نے بنا اور حالات نے سمجھا دیا کہ یہ جدت کا دور دیکھنے میں شہر۔ مگر اندر سے زہر ملا ہل ہے۔ طبیعت ہی خیال پلٹا، رائے بدل، ادھر بھجکا تو ساس اور سالی دونوں کی زندگیاں جنت تھیں۔ برکت تھی۔ پتہ لگ اور سراغ مل گیا۔ کہ قدامت کہنے کو جہالت، مگر حقیقت امرت ہے۔ اور یہ ترقی کے نعرے دیکھنے میں پیارے ہوں۔ مگر آگ کے شرارے ہیں۔ ترقی اگر ممکن ہو تو صرف مذہب کے ساتھ اور مذہب ان جاہلوں کا مجھ جیسے پڑھے لکھوں سے بدیں اعتبار بہتر کہ ملیگا تو غریبوں میں رہے گا تو مفلسوں میں اور ختم ہو گا تو ان ہی بیچاروں پر۔

خدا کی قدرت تھی کہ وہی حسن جو ترقی کے نعرے لگاتا چاروں طرف پھرتا تھا جس کی تحریر اور تقریر جس کا گھر اور بار جس کی بیوی اور بچے جدت کا کٹل و عطف جس کی زبان سے (فلم کے سوا) کبھی خدا کا نام نہ نکلا۔ اس خشوع اور خضوع سے نماز پڑھتا کہ دیکھنے والے تعجب کرتے۔ شاہن اس کی نماز پر اس کی دعا پر ہنستی۔ مسکراتی، تعجب کرتی۔ وہ دل ہی دل میں دانت پیستیا تیور سی چڑھتا۔ دیکھتا بھرتا اور سستنا جو کہا جاتا۔ مگر زبان سے ایک حرف نہ کہتا۔ اتفاق دیکھو کہ کلب کا ہوا سالہ جلسہ دور دور سے آئیں عورتیں۔ دھواں دھار ہوئیں تقریریں۔ اور صدر جلسہ نے اپنی

چھپی ہوئی تقریر اس طرح پڑھی جس کا مفہوم یہ تھا :-

”ہمارا چہالت کا زمانہ ختم ہوا۔ ہم میں جو چند پرانی عورتیں زندہ ہیں وہ چند روز کی مہمان ہیں۔ یہ حیثیت مسلمان ہونے کے ہمارا اب فرض ہے کہ وہ کوشش کریں جو ہماری لڑکیوں کو تعلیم یافتہ بنادے۔“

اتفاق کی بات ہے کہ بہن کے پیرا صرار سے اس جلسہ میں زاہدہ بھی چلی گئی تھی۔ اور جہاں تک ہم کو معلوم ہے یہ اس کا پہلا اتفاق تھا۔ ورنہ وہ کہاں اور اس قسم کے جلسہ کہاں۔ سرمنڈاتے ہی اویے پڑے۔ پہلی ہی شرکت کا نتیجہ یہ ہوا کہ بجائے فرحت کے کلفت ہوئی۔ تقریر سنتے ہی بدن میں آگ لگ گئی۔ بھری ٹیپھی تھی۔ کہ گیدڑ کی شامت آئی۔ اور شہر کی طرف رخ کیا۔ شاہدہ جو اس وقت پورے زوروں پر تھیں اور ایک سے ایک بڑھے چڑھے حمایتی موجود تھے۔ بہن سے کہنے لگی :-

”آپ کیوں خاموش ہو گئیں۔ کچھ فرمانا ہے تو فرمائیے۔“

”ممدور چلے۔“ ہاں ضرور ضرور ہم چاہتے ہیں کہ آپ کے زیریں خیالات سے مستفید ہوں۔“

دوسری لڑکیاں۔ ”بیشک بیشک محترمہ ضرور ارشاد ہو آپ کی

بہت تعریف سنی ہے۔“

شاہدہ۔ ”آپ سب بیویاں خاموش ہو جائیں۔ میری ہنسیرہ محترمہ

مسرا حسان کچھ فرمانا چاہتی ہیں۔“

بیویاں خاموش ہو گئیں۔ اور سب کی شرما شرمی زاہدہ کھڑی ہوئی اور کہا :-

بہنو! مجھے آج آپ کے جلسہ میں شریک ہو کر خوشی بھی ہوئی

اور سچ بھی۔ خوشی اس بات کی کہ بہنوں میں اپنی حالت کی بہتری کا احساس

شرع ہے۔ اور امید ہے کہ وہ رفتہ رفتہ بہت کچھ ترقی کریں گی اور  
افسوس اس امر کا جہاں صدر جلسہ کی تہذیب یہ ہو کہ تانیوں اور دایوں کو  
جاہل کہنے میں بھی باک نہ ہو وہاں حاضرین تو با و آدم اور اماں خوا  
کو جو کچھ بھی نہ کہیں وہ محفوظ رہا۔

میں اس وقت کسی تقریر کے واسطے تیار نہیں ہوں۔ اور اس لئے  
ابراکین جلسہ کی طرح میرے پاس کوئی لکھی ہوئی تقریر موجود نہیں  
جو میں طوطے کی طرح رٹ کر آپ کے روبرو پڑھ دوں۔ میں جلسہ  
کی صدر صاحبہ سے کچھ عرض کرنا چاہتی ہوں۔

بڑی بوڑھیوں کو جاہل کہہ دینا صرف زبان کا ایک سکندر کا کام ہے  
اس میں ہلکی لگتی ہے نہ پھٹکری۔ جو لوگ خدا کے منکر ہیں ان کو  
بھی یہ کہنے میں کہ خدا کوئی نہیں کچھ زیادہ سامان کی ضرورت نہیں  
ہوتی۔ صدر صاحبہ نے نہایت اطمینان سے پرانی عورتوں کو جہلا میں  
شامل کر دیا۔ میں اس سے پہلے بھی یہ افواجہ بعض لڑکیوں سوسن چکی  
ہوں۔ مگر بحث یہ ہے کہ کیا زبان سے کسی کو کچھ کہہ دینا کافی ہو سکتا ہے؟  
اگر میں اس وقت یہ کہوں کہ میں عورت نہیں مرد ہوں تو کیا یہ میرا  
کہنا صحیح ہوگا؟

عورت ہے کہ ہر دعوے کے ساتھ ثبوت ہو۔ زیادہ سے  
زیادہ اس کے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ جہالت کا ثبوت اس سے  
زیادہ کیا ہوگا کہ ان کے عقیدے درست نہ تھے، وہ تعویذ گندے  
ٹوٹے ٹوٹکوں وغیرہ کی قابیل تھیں، وہ جی تھیں۔ بہت سی کمزور  
باتیں ان کے ٹھکانوں میں شامل تھیں۔ مگر میں کہتی ہوں یہ صحیح نہیں

مجھے اس سے انکار نہیں کہ وہ دہی تھیں۔ مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ انکے بعض عقیدے کمزور تھے مثلاً انکو دم تھا کہ سینڈا جس بچے کے نکل رہی ہو۔ اسکے پاس دھوبن نہ آئے۔ یا بچے کے پاس دھوبن نہ آئے ورنہ بہت برا۔ یہ پاس قسم کی اور باتیں ہیں جو ثبوت میں پیش ہو سکتی ہیں مگر کیسے انوں کی بات کر کہ دیرہ دانستہ جان بوجھ کر انصاف کی آنکھوں پر مٹ دھری کی پٹی باندھی جاتی ہو۔ پھولوں کو کانٹے اور مٹیوں کو پتھر ثابت کیا جا رہا ہو۔ کیا کوئی ذی عقل اس سے انکار کر سکتا ہو کہ ماننا کے مقابلہ میں نیا کی کوئی شے وقعت رکھتی ہو۔ ایک بچہ کو چپک نکل رہی ہو۔ ماں رات دن اسکو گود میں لئے رہتی ہو۔ اگر اس کو یہ یقین دلایا کہ دھوبن کا آنا بچہ کیواسطے مضر ہے تو وہ زبردست احتیاط اور روک تھام کی لگی۔ جس کا عشر عشر بھی آج نہیں ہوتا۔ بچہ چپک میں ہے۔ ماں مولیٰ مرض میں گرفتار نہیں۔ مرض مندری ہو۔ اور بہت ممکن ہواں پر بھی اثر ہو گیا ہو۔ قویٰ شبہ ہے کہ گھر کے کپڑوں میں اثر موجود ہو۔ اگر یہ کپڑے دھوبن کو دیئے گئے اور اس ذریعہ سے جراثیم ان تمام کپڑوں میں پہنچ گئے جو دھوبن کے ہاں موجود ہیں تو تمام شہر اسی مرض میں گرفتار ہو جائیگا۔ بناؤ یہ جہالت ہے یا علمیت کیسی اچھی طرح ایک بات بتا دی۔ ان کے ذہن میں تو یہ باتیں بطور عقیدہ سے ہوتی تھیں۔ مگر ان تمام باتوں کی علمیت پر خود کو تو اچھی طرح سمجھ سکتی ہیں یہ ہی کیفیت زچہ اور بچہ کی ہے۔ دھوبن کے یہاں کسی ایسے نتیجے کو گھر سے کپڑے آئے جہاں مرض مندری ہے تو اس کو زچہ بچہ کے پاس نہ آنا چاہیے۔ بچہ بزرگ ہے اور بہت جلد اثر قبول کر لے گا جس بات کو تمہارا جی چاہے لے لو، جہالت نہیں پوری علمیت ثابت ہو گی اور جہن

علوم کا تم نے فقط نام ہی سنا ہے وہ اس طرح ان سے ماہر ہوتی  
 تھیں تم کہتی ہو گی کہ یہ باتیں ان کی گھٹی میں اس طرح پر گئی تھیں کہ وہ اسکی  
 اصلیت کو بلا سوچے سمجھے پتھر کی لکیر سمجھتی تھیں۔ تمہارا یہ کہنا غلط ہوگا  
 معمولی عورتوں کی تو کہتی نہیں۔ مگر شریف خاندان کی خواتین ان گروں سے  
 اچھی طرح آشنا تھیں۔ رہے گندے تعینداس کا مجھے اعتراف ہے کہ  
 یہ رغبت ان میں نسبتاً زیادہ تھی۔ لیکن اس کو میں جاہلیت سے منسوب  
 نہیں کر سکتی۔ اور یہ کہوں گی کہ دنیا سے ناپائدار خدا کے خاص بندوں  
 سے کبھی خالی نہ رہی۔ اور تاریخ مسلمانوں میں ان پاک نفوس کا وجود  
 ثابت کر رہی ہے۔ جن سے یہ توقع کیجا سکتی تھی کہ ان کی التجاؤں کا بارگاہ  
 صمدی میں قبول ہونا زیادہ ممکن ہو۔ یہ ہی بڑے رجوع جمع کو تم گندے  
 تعویذوں سے تعبیر کر لو۔ مگر یہ سن لو کہ زمانہ کی موجودہ ترقی کے ساتھ ہی آپ  
 لوگوں کی تعداد بھی بڑھی۔ جو حقیقت کچھ نہ تھی۔ مگر وہ دنیا کے سامنے  
 اس لباس میں جلوہ گر ہوئے۔ اس دور جدید کے ایک اعتراف کا جواب  
 میرے پاس ہیں کہ مذہب ہی جہالت ہے۔ یہ آپ زبان کو نہ فرمائیں مگر واقعتاً  
 آپ کے اس خیال کی تائید کر رہے ہیں۔ اگر مذہب کا نام جہالت ہو تو یہ جہالت  
 انہیں ضرور جوڑتی۔ غالباً ترقی سے آپ کا مقصود یہی ہے کہ جہالت یعنی  
 مذہب بتدریج کم ہوا میں آپ کو غرور کامیابی ہوئی اور مذہب کی عظمت  
 روز بروز گھروں سے اُڑ رہی ہو جاہلوں کا یقین یہ تھا کہ جس گھر میں بارہ برس  
 کی لڑکی بے نمازن ہو وہاں رحمت کے فرشتے نہیں آتے۔  
 اگر صبح اٹھ کر نماز سے فارغ ہو کلام اللہ پڑھا جائے تو دن بھر خوشی کی گنتا ہے۔  
 رات کو سووتے وقت بچھوٹوں میں بیٹا کر کلام اللہ پڑھ پڑھ کر مڑوں کو

پہنچاؤ کہ ان کو ثواب ملے اور عذاب میں تخفیف ہو۔  
دسترخان سے اگر کسی غریب مسکین کو کھانا چلا گیا تو کھانے کا حساب ہو  
وعظ اور ذکر و ملائت گھر میں اکثر ہونا چاہیے۔  
بارہ برس کم کے بچے اگر بغیر نماز یا رکے مر گئے تو ان کا عذاباں باپ پر ہوگا۔  
رات کو سوتے وقت آیت الکرسی پڑھ کر سوؤ تو ہر قسم کے ڈر اور  
خوف سے محفوظ رہو گے۔

شیطان کو رستہ زیادہ اذیت مصوم بچوں کے سجدے سے ہوتی ہے۔  
کواری لڑکیوں کو جو ان لڑکوں سے ہنس کر بات نہ کرنی چاہیے۔  
سفیر بالوں کا ادب کرو۔ ان کی دعا زیادہ قبول ہوتی ہے۔  
بڑا نالہ کھاؤ۔ بڑا ابل نہ بولو۔ یعنی غور نہ کرو۔  
بچہ کو گود میں اٹھاؤ تو ہم اللہ کہہ کر ناکہ یہ آواز اس کے کانوں میں پڑے۔  
دروہ و تفریق گھر میں پڑھنے سے برکت ہوتی ہے۔

غالباً جہالت سے آپ کا مقصد یہ عقائد ہیں۔ اور مجھ کو یہ حق حاصل ہے  
کہ میں آپ کو مبارکباد دوں کہ آپ کی کوشش کامیاب ہوئی اور یہ جہالت  
اب بہت کم ہو گئی۔ یہ آوازیں اب مسلمان بہت کم سنتے ہیں۔ جاہل ہویوں  
کے عقائد کا انحصار اس شخص کے الفاظ اور ارشاد پر تھا جو خاک عرب سے  
اُٹھ کر تمام رتے زمین پر ڈنکا بجا گیا۔ اور فرما گیا جو مخلوق کے نزدیک اچھا،  
وہ خدا کے نزدیک بھی اچھا۔ اور جو مخلوق سے برا ہو وہ خدا سے بھی۔ ان کی کوشش  
یہ تھی کہ مرنے کے بعد جن لوگوں سے زندگی میں سابقہ پڑا ہے وہ انکی موت  
پر روئیں۔ مجھے صاف کرنا اگر میں کہوں کہ تعلیم یافتہ ہویوں کے کارنامے انکی  
زندگی میں اخباروں اور رسالوں میں چھپتے تو دانتی ہیں۔ لیکن ان کو

رونے والے غیروں میں کیا اپنوں میں بھی نہیں کیونکہ ان کے وجود سے حقیقی  
 مسرت کسی تنفس کو نہیں پہنچتی۔ مجھ کو اپنی بڑی نانی آیا دیں میں اس  
 سال کی تھی اور جو منظر اس وقت میری آنکھوں نے دیکھا عمر بھر یاد رکھو گی  
 رات کو تین بجے انہوں نے انتقال کیا اور صبح تک یہ خیر تمام شہر میں شہرہ  
 ہو گئی۔ جنازہ صحن میں رکھا تھا کہ محلہ کی غریب عورتیں لپٹ لپٹ کر چھین  
 مارنے لگیں۔ یتیم بچے چار پائی سے لپٹ گئے۔ رانڈیں قبرستان تک  
 بچھاڑیں کھاتی ساتھ بھتیس۔ میں بچہ بھتی۔ سمجھ نہ سکی بعد میں معلوم ہوا کہ  
 ان میں سے کسی کی تنخواہ مقرر تھی، کسی کا کپڑا، کسی کا کھانا، وہ جاہل تھیں  
 مگر ایسی جاہل کہ آج ان کے شاگرد شہر میں ایسے جید حافظ موجود ہیں  
 جو ہر سال تراویح میں ان کی جہالت کے کارنامے بلند کر رہے ہیں۔  
 شاہد نے تو بہن کو زک دینے کا ایک موقع ملنا تھا۔ مگر انہی ڈانگیں گلہیں گئیں۔  
 زاہد کی تقریر سو مجلس میں ایک سنا چھا گیا۔ دیکھتے ہیں تو رباعیوں تھے مگر بعض لوگوں نے ال دہنی بھرتے

## چوبیسواں باب

اب حسن کی زندگی عجیب زندگی تھی دقت کا بڑا حصہ علماء کی صحبت اور مذہب کی  
 خدمت میں بسر ہوتا کر ڈالتے جاڑوں کی ان راتوں میں جب مائیں شاہد کے سر ہاتھ اور  
 پائنتی دہتی ہوئی انگلیٹھیاں روشن کرتیں وہ چار بجے اٹھ کر مسجد آتا۔ اور اپنی پانچ سو نمازیوں کے وضو  
 کا پانی گرم کرنا۔ آدمی خوش الحان تھا صبح کی اذان اس جوش و خروش سے دیتا کہ سننے والے تھرا جاتے۔  
 اندیشہ نہ یہ تھا کہ شاہد کے لڑکے شاہد کا ماں کے پاس لہ کر اور ہلکی ہٹوتی  
 پڑھ کر ناس ہو گا۔ اور وہ باب کو محظوظ الحی اس سمجھے گا۔ مگر وہ مذہب کے اعتبار سے اس  
 دقت کا دوسرا باب تھا۔ تعجب ہوتا اور خدا کی قدرت یاد آتی تھی کہ جس ماں نے سوا کلب

کے کبھی گھر پر خدا کا نام نہ لیا اس کا بچہ اور نگوڑے کی کچھ بساط بھی تو نہیں۔ بارہ برس کی جان اور ایسا مسلمان کہ چھٹھہ بیاکھ کے روزے رکھے۔

شاہر کا یہ تو اچھی طرح سمجھتی تھی کہ میاں اور لڑکا دونوں میرے ڈھنگوں سے خوش نہیں۔ مگر وہ دونوں کو جاہل اور بے وقوف جان رہی تھی۔ سچ پوچھو تو اس کے دامن پر ایک ایسا دھبہ تھا کہ وہ بات تک کرنے کا حق نہ رکھتی تھی۔ مگر خدا بے غیرتی کا بھلا کرے۔ کبھی آنکھ جھپٹی نہ دل نادم ہوا۔ اگر کتنی اسی طرح اور پھلتی اُس سے زیادہ، ہماری رائے میں تو بد نصیب کی برادری کا سارا بار باپ کی گردن پر ہے۔ یہ صحیح کہ وہ خود راہ راست پر آچکا تھا۔ مگر جو بیچ بودے تھے۔ اس کے پھل کیوں کر غارت ہو جائے۔ خدا کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں شاہر کا کی مانند ہی حسن اور شاہر دونوں

کے واسطے تازیانہ ہوئی۔ اور دونوں نے مصمم قصد کیا کہ اپنی زندگی قوم کیواسطے وقف کر دیں اور دنیا کو دکھائیں کہ تعلیم نسواں کیا چیز ہے۔ حسن کے پاس روپے کی کمی نہ تھی۔ اس نے لیم اللہ کہہ کر مدرسہ کھول دیا۔ اور تعلیم شروع کر دی۔ مسلمان اُستانیوں کا ملنا مشکل تھا۔ چوتیس آگئیں ان کو سرائیکھوں پر رکھا۔ اور جو کمی رہی حسن نے اپنی ذات سے پوری کی۔ انتظام یہ تھا کہ چھ برس سے دس برس تک کی لڑکیاں داخل ہو سکیں۔ حسن ان بچیوں کو خود پڑھاتا، لکھاتا، مذہبی تعلیم ہر لڑکی کے واسطے لازمی تھی۔ اور باقی والدین کی خوشی پر منحصر۔ مدرسہ کا شوق ایسا ہوا کہ حسن بیوی بچے گھر بار سب بھول گیا۔ دن رات وہ تھا، اور مدرسہ تھا۔ چند روز میں مدرسہ اس قدر ترقی کر گیا کہ دُور دُور سے لڑکیاں آئیں اور داخل ہوئیں۔ چار سال کے بعد جو لڑکیاں کامیاب ہو کر نکلیں وہ قوم کا مول تھیں۔ علوم جدیدہ کی جہارت کے ساتھ مذہب ان کی رگ رگ میں پیوست تھا۔ اندر کا تمام کام حسن کے سپرد تھا۔ انتظام شاہر کے حسن کی نیت پاک اور کوشش صاف تھی۔ خدا نے برکت دی۔ اور حسن نے دکھا دیا کہ مذہب نظر انداز نہ ہو تو تعلیم نسواں اسلام کا جزو عظیم ہے۔



شاہد اب باپ کا برابر کا بازو کامیابی کا راز اور اس کے تمام مقاصد کی جان تھا۔ اپنی تعلیم سے فارغ ہو کر جو وقت بچتا سب باپ کی کوششوں میں صرف کرتا۔ مدرسہ کا سالانہ امتحان ہوا۔ شاہد نے وقت اٹھ کر نہ پایا۔ نماز پڑھی۔ مدرسہ پر رات بتاؤ کیا ہوا؟۔ شاہد کی خاطر ملازمت میں مصروف تھا کہ گردہ میں کسک مچ گئی۔ دوپہر تک ٹانگا اور پھر تاربا۔ مگر ظہر کے بعد تو پھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ آپاں ہمارے ہاتھ اور ایک زمین بٹھا ہوا بیٹے سے متنفر اور بیٹا اس سے بیزار۔ مگر ماضی سننے ہی پاؤں تلے کی زمین بکھل گئی۔ گھر آکر اٹھی اور بیتاب ہو کر آئی۔ دیکھتی ہے تو بچہ کارنگ سفید پڑا ہے۔ ستائیس برس رہ گئی۔ ڈاکٹر حکیم برابر آ اور جارہے تھے۔ منہ پر بخار اور لپ لپ بدلا جا رہا تھا۔ مگر دور تھا کہ کسی عنوان کم نہ ہوتا تھا۔ درد بچہ کے گردہ میں تھا۔ اوریاں کا کلیجہ نکلا پڑتا تھا۔ اس کے منہ پر منہ رکھتی تھی۔ اس کی مکر کڑی تھی۔ شاہد کی تکلیف جسمانی تھی اور شاہد کی روحانی مگر شاہد کی اذیت بچہ کو کم نہ تھی۔ اس کی چرخش اور راہ کیساتھ بے چین ہوتی۔ دلی ملالت اور جھوٹ کہتا:۔

”ہائے ماں جان کیا کروں؟“

تو گلے میں ہاتھ ڈال کر لیٹ جاتی۔ دن یوں ہی اور رات ساری اسی گریب واضطراب میں بسر ہو گئی۔ شہر بھر کے علاج اور دوا بھر کے عین کڑوائے مگر درد میں فرق نہ پڑا۔ مجبور ڈاکٹر نے منہ کی دوا دی تو ذرا کھل گئی۔ شاہد کا روٹ میں بیٹھی ٹانگی پاندے بچے کی صورت دیکھ رہی تھی۔ اور حسن الگ خاموش بیٹھا تھا۔ حسن کا حال جو کچھ بھی ہو مگر شاہد کی کیفیت تو یہ تھی کہ دل اٹا اٹا اور کلیجہ نکلا پڑتا تھا۔ اس کی موت کا خیال ایک بجلی تھی جو سر سے پاؤں تک ایک عجیب حالت پیدا کر دیتی تھی۔ چونک پڑتی تھی اور آہستہ سے اس کے منہ پر ہاتھ پھر کر کھینچتا تھا۔ شاہد ان ہی خیالات میں منہمک اور اندکار میں مستغرق تھی کہ مسجد سے صدائے توحید بلند ہوئی۔ اور موزون کی آذان نے رات کی خاموشی

سلسلہ توڑا۔ چاند بھرم اور تارے پھیکے پڑ کر حیاتِ انسانی کی بے ثباتی کا درس دے رہے تھے۔ اذان سنتے ہی حسن یہ کہہ کر اٹھا :-

”حق نام تیرا“

شمس کی بتی سامنے جھللا رہی تھی کہ شاہق کی نظر پڑی۔ اور اس نے دل میں سوچا یہ ہی کیفیتِ انسانی ہے اگر کہ ہے۔ سچ یہ ہے کہ دنیا کا۔ بات فانی۔ باقی رہنے والی ہر تو وہی ایک ذات ہے اللہ نہ کہجئے وہ اور آپ ہشتہ خوش یاقین پھر آنکھ کے سامنے آیا۔ بلبل اٹھی۔ یہ پہلا روز بلکہ پہلا انفاق تھا کہ شاہق نے زبردست طانت کا اعتراف کیا۔ اور فوراً تصدیر کیا کہ عاجزی کا سر اس کے حضور میں جھکا کر بچہ کی سلامتی کیواسطہ التجا کروں۔ اٹھی وضو کیا نماز کو کھڑی ہوتی تھی۔ اور اگر نماز ہو جاتی تو یہ پہلا سجدہ تھا جو ایک فرشتہ عورت کی طرف سے خدا کے حضور میں ہوتا۔ مگر بچہ کی اس آواز نے :-

”ہائے اماں میری جان نکلی۔ پریشان کر دیا۔ اور دوڑی اور یہ کہہ کر آئی۔

”میں اپنے بچے کے قربان۔“

بیہوش بچہ کا سر ماکے گود میں تھا۔ جھنجھوڑتی تھی، جگاتی تھی، چلاتی تھی۔ مگر ہر کوشش بے سود اور بیکار تھی کہ شاہد ماکے گود میں ایک ہلکی سی سبکی لیکر ختم ہو گیا۔

## بچہ کی سوال باب

[زاہدہ کو پہاڑ سے آئے ہوئے دو سال بھی نہ ہوئے

تھے کہ ایک روز غلات معمول دو بجے احسان تنفکرو منوم دفتر سے آکر اپنے کمرہ میں خاموش بیٹھ گیا۔ زاہدہ اس کے اس طرح بے وقت اور چپ

چاپ آنے سے پریشان ہو گئی، اور پوچھا :-]

”خیر ہے اس وقت کیسے آئے؟ جی تو اچھا ہے؟“

احسان کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے ہوئے تھے۔ بیوی کی صورت دیکھ کر دل بھر آیا۔ مگر ضبط کیا اور کہنے لگا۔

’خیریت کیا ہے، جو کیا اس کی سزا بھگت رہا ہوں۔ دیکھئے کتنی بھگتنی پڑتی ہے۔‘

زراہدہ۔ ”آخر بتاؤ تو سہی کیا ہوا، کیا کام میں کوئی غلطی ہو گئی؟“

احسان۔ ”نہیں کام میں تو غلطی نہیں ہوئی، اب زندہ۔“ غلطی کی سزا مل گئی۔

زراہدہ۔ ”سات سال تک، اور ایک مہینہ شاہدہ۔“

احسان۔ ”کیا بتاؤں؟ اور کس منہ سے بتاؤں؟ آج افسر نے بلا کر بہت

سخت سٹت کہا اور موقوف کر دیا۔ اس بکثت نے جو دہن کی حیثیت سے آئی تھی اور

جس سے نکاح کرنا زندگی کی سب سے بڑی غلطی ہے۔ ہر کا دعویٰ کر دیا۔ کل مقدمہ ہے خسر صاحب

تشریف لائے تھے۔ نہ معلوم صاحب کے کان میں کیا بھرا کہ نوکری بھی گئی، رسوائی بھی

ہوئی۔ میں جب باہر نکلا ہوں تو وہ خود بھی مرتع اور بے باپ کے ساتھ بڑے نیچے کھڑی

تھی۔ ایسی خلاف تہذیب باتیں کہیں کہ زبان سے نہیں اُٹھ سکتا۔ میں نے سب

باتوں کا جواب دیا۔ والد صاحب کھڑے کھڑے اور ہنستے رہے۔ سچا آخر میں کیا کہتی ہے۔

”اب میں تمہارے نکاح میں نہیں رہنا چاہتی۔ جس قدر جلد ممکن ہو مجھ سے قطع تعلق کرو۔

اگر تم کہو گے تو میں مہر میں سے کچھ حصہ چھوڑ دوں گی۔“

زراہدہ۔ ”تشویش کی بات ضرور ہے۔ لیکن خدا پھر بھر دسہ کرو، وہی ہر

مشکل آسان کرتا ہے۔“

آج دن کا باقی حصہ اور ساری رات گھر بھر میں پریشانی کی گزری، علی الصبح

زاہدہ کا ڈولی کر ایک لڑکے کو ساتھ لے ہوٹل میں پہنچی۔ بیگم صاحبہ نے اندر آنے کی اجازت

دی۔ دشمنی کی صحبت یا تہذیب بیوی۔ اور اُنکے والد صاحب کے متفقہ تہمتہ نے زاہدہ کا استقبال

کیا۔ اور حبيب زاہدہ نے لڑکے سے یہ کہلوایا کہ اگر آپ کے والد صاحب اجازت دیں تو چند لمحہ

”تنہائی میں گفتگو کرنی چاہتی ہوں، تو اس کا یہ جواب ملا، ”ایسی کیا تحلیل کی بات ہے، تمہارے شوہر نے جو دعا دی اس کا ثمرہ اس کو بھگتنا ہے، کوئی وجہ نہیں کہ تمہاری وجہ سے اپنے والد کو باہر جانے کی تکلیف دوں۔ تم ہی جیسی جاہل کندہ ماتراش عورتوں نے عورت کے نام کو بٹہ لگایا۔ احسان یقیناً سزا کا مستحق ہے۔ اور میں ہرگز درگزر نہ کروں گی۔“

**زادہ۔** ”وہ آپ کے شوہر ہیں۔ ایسے الفاظ استعمال نہ کیجئے۔ اگر ان سے کوئی غلطی ہوئی تو زیادہ خیال نہ کیجئے، وہ اور آپ ہمیشہ خوش رہے ہیں۔ ان کی اور آپ کی دونوں کی ہر ممکن خدمت کو حاضر ہوں۔“

**سوگن۔** ”تمہاری جہالت افسوسناک ہے! تم میرے سامنے ایسے فریبی انسان کا نام مت لو۔ وہ میرا شوہر نہیں ہے۔ ایسے دعا باز کو میرا شوہر کہنا میری توہین ہے۔ وہ تم جیسی ذلیل عورتوں کے قابل ہے۔ میں ایسے بے ایمان مفلس کا لیکر کیا کروں گی۔ اب آپ تشریف لے جائیے، مجھے کچھری جانا ہے۔“

**زادہ۔** ”میں ہر کے متعلق اس قدر عرض کرنا چاہتی ہوں۔“

**سوگن۔** ”بس بس زیادہ پریشان نہ کیجئے، میں کچھ سنا نہیں چاہتی۔“

زاہلہ اسٹے پاؤں واپس ہوئی تو احسان دالان میں ٹہل رہا تھا۔ دریافت کیا کہ کہاں گئی تھیں؟ گلاس نے کوئی جواب نہ دیا اور خود ہی دریافت کیا کہ کچھری جاؤ گے؟

**احسان۔** ”جا کر کیا کروں گا! اور سب کے سامنے ذلیل و رسوا ہوں گا۔“

باوجود انتہائی کوشش کے مقدمہ اور بیماری یہ دو حلے ایسے ہوئے کہ زہلہ ایک لمحہ کے واسطے شہر کو خوش نہ دیکھ سکی۔ اس واقعہ کا تیسرا ہفتہ تھا کہ دوپہر کے وقت ایک دن میاں بیوی مالی ضروریات پر غور کر رہے تھے کہ باہر سے کسی شخص نے آواز دی۔ احسان باہر گیا تو معلوم ہوا کہ ہمبرجل کی ڈگری میں گرفتاری کا وارنٹ ہے۔ احسان نے اندر جانا چاہا تو اجازت نہ ملی اور احسان جیل خانہ پہنچ گئے۔

## بچھیسوال باب

مقدمہ کی کامیابی سے خوش ہو کر زاہد کا کی سوکن نے کلب میں جلسہ کیا اور خانمہ پر ایک مختصر تقریر میں فرمایا:-

”مردوں کو اگر ان کے اعمال کی اس طرح کافی سزا ملتی ہے تو قوم بدبخت بہت جلد اپنے تمام مقاصد میں کامیاب ہو جائے۔ نصف سے زیادہ قوم ان سنگدل افراد کی بدولت مردہ ہو چکی۔ اور اب ہم صرف اس مرض کی دوا ہیں کہ ان کے احکام کی تعمیل کریں۔ اور لونڈیوں کی طرح حکم بجا لائیں۔ میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ اگر اسی طرح مسلمان عورتیں اپنے شوہروں کے ساتھ سلوک کریں تو چند ہی روز میں مردوں کی بدسلوکی کا خانمہ ہو جائے۔ خوشی کی بات ہے کہ دغا باز احسان انستہ

اپنے کئے کی سزا بھگت رہا ہو۔ اور حیل خانہ کی چار دیواری میں سڑ رہا ہے۔“ تقریر ختم ہوئی تو سامنے کے کونہ سے ایک برقع پوش عورت اٹھی۔ اس کے کپڑے میلے تھے۔ اور بال پریشان۔ اس نے گھڑے ہو کر کہا: اجازت ہو تو چند منٹ میں بھی کچھ کہوں؟ بیویاں اس کا منہ تھکتی رہیں۔ اور ایک نے کہا: ”فرمائیے“ تو زاہد نے کہا:-

”آپ جیسی محترم خواتین لاریب مسلمان عورتوں کی دواسطے قابلِ عزت ہیں اور نہایت مبارک ہو گا وہ وقت جب مسلمان عورتیں مردوں کی ناجائز گرفت سے آزاد ہو کر وہ حقوق حاصل کریں گی جو مذہب مقدس نے ان کو عطا فرمائے۔ مگر کیا آپ مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت دیں گی کہ آپ نے جو طریقہ اختیار کیا۔ اور جو زندگی آپ بسر فرما رہی ہیں یہ اسلام اور مسلمانوں کی دواسطے کس حد تک قابلِ فخر ہے۔ اس سوال کا جواب عنایت فرما کر ممنون سمجھے کہ

کیا اسلام اس کا نام ہے کہ شوہر بیوی کے ہاتھوں جیل خانہ پہنچے؟  
میری خترم بہن کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ آپ کو کیا یہ علم نہ تھا کہ آپ جس شخص  
سے نکاح کر رہی ہیں یہ دوسری بیوی کا شوہر بھی ہے؟ کیا آپ کا اسلام ہی  
تھا کہ اپنی ایک بہن کے تمام حقوق یا مال فرما دیجئے؟ اگر نکاح ثانی اس کا  
شرعی حق تھا تو شکایت کیسی؟ اور نہ تھا تو آپ اس کی مرتکب کیوں ہوئیں؟  
کیا شرانت کا تقاضا یہی ہو کہ کل آپ جس کی بیوی تھیں۔ وہ آپ کے مہر محل  
کی بدولت آج جیل خانہ جائے۔ اور آپ خوش ہوں؟ کیا انسانیت کے یہی معنی  
ہیں کہ جب تک اس کو دوسری بیوی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا قسم تھا۔ آپ اس کی  
تھیں۔ اور جب اُس نے آپ کی ایک بہن کو آپ کی ایک جنس اور اپنی بیوی کے  
حقوق پر توجہ کی تو آپ اس کی دشمن ہو گئیں؟

بیوی اس بد بخت قیدی کی منکوحہ میں ہوں اور جیسا کہ میں کر چکی ہوں اب  
بھی اس کے واسطے آمادہ ہوں کہ میں اور میرے بچے آپ کی خدمت میں لوٹیں  
علاموں کی طرح بسر کریں گے۔ آپ غور فرمائیے کہ میں نے یہاں سے ہر راہ آپ کو  
نصف تنخواہ روانہ کی۔ اور جو کچھ خدا نے دیا اس میں آپ کے حقوق کو کبھی نظر انداز  
نہیں کیا۔ لیکن برخلاف اس کے آپ نے میرے ساتھ جو کچھ کیا ہمارے آسمان  
وزمین مرکان کے در و دیوار اور محلہ کے مرد و عورت اس کے شاہد ہیں۔ آپ کو رو  
وقت یاد ہو گا جب میں بے گناہ آپ کے حکم سے نکالی گئی۔ اور آپ نے مجھ پر چوٹی کا الزام  
اٹھا کر وکا۔ زیور کی پوٹلی میرے صندوق سے نکلی اور سینکڑوں عورتوں مردوں  
نے میرا تماشہ دیکھا! میں نے اس وقت بھی جب میری آبرو خاک میں ملی صبر کیا۔ اور  
آج بھی تمہاری شکر گزار ہوں۔ آپ کے ہر میں یہ میرا زیور حاضر ہے۔ قبول  
فرمائیے۔ اور بد نصیب شدہ ہر کہ قید سے رہائی دلوائیے۔

یہ کہہ کر زارہؔ نے سب بیویوں کے سامنے زیور کی صندوقچی رکھ دی تو مرجبا  
مرجبا کے نعروں سے کمرہ گونج اُٹھا۔ زارہؔ کی آنکھ سے آنسو جاری تھے۔ اور قریب  
قریب تمام عورتیں سوکن پر لعن طعن کرنے میں اس کی ہموا تھیں۔ اسی وقت باضابطہ  
رہبر کی لکھوائی گئی۔ اور اس طرح احسان کو صبح ہی جیل خانہ سے رہائی ملی۔  
احسان کے وہ انسر جنہوں نے اس کو موقوف کیا تھا۔ ان کی بیوی بھی جلسہ  
میں موجود تھیں۔ انہوں نے مفصل حال ڈپٹی صاحبؔ کہا اور احسان دوبارہ ملازم ہو کر  
زارہؔ کے ساتھ اطمینان کی زندگی بسر کرنے لگا۔

## ستائیسواں باب

شاہل کی موت کا عرصہ ایسا نہ تھا کہ حسن آسانی سے برداشت کر لیتا۔ لاکھ بٹھانے  
کی کوشش کرتا۔ مگر دل اندر سے بیٹھا جاتا تھا۔ کھانا پینا چھوٹ گیا۔ ہر وقت وہ تھا اور  
قبرستان۔ نیند بھوک اڑ گئی۔ بچہ کے غم میں بچوں کی طرح روتا۔ ایک ایک کا منہ حسرتؔ  
’لگتا‘ اور کہتا ’اللہ شاہل کی صورت دکھا دو‘ طبیعت نڈھال اور دماغ خراب ہو گیا۔  
قبر کو چھٹتا، تعذیب کو پیار کرتا، درختوں سے سر پہڑتا، خاک کو آنکھوں سے لگاتا، روتا،  
بلبلاتا، چیختا، پیٹتا، پرندوں سے گرگڑاتا، بادلوں سے تلخی ہوتا، چاند سے خطاب کرتا،  
سورج سے سوال کرتا، دن بھر جنگل کی خاک چھانتا، اور رات بھر قبرستان میں داوہلا  
مچاتا۔ چند روز میں ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا۔ جس میں سوائے سانس کے کچھ نہ تھا۔  
سُرخ و سفید رنگ جھلس کر سیاہ، اور ہاتھی جیسا ڈیل سوکھ کر کاشا ہو گیا۔

چارپانچ مہینہ اسی طرح بسر ہوئے۔ اور اب حسن کو یقین ہو گیا کہ جس نذرانے  
زندگی میں میرالال مجھ سے جُدا کر دیا۔ وہ مرنے کے بعد مجھ سے ملا دیگا۔ دس ہزار  
روپے کی جائداد بیوی کو دی۔ باقی تمام اثاثہ مدرسہ کے نام وقف کر دیا۔

حسن کی مصیبت سے شہر بھر کو ہل رہی تھی۔ مگر مصیبت ہی ایسی تھی کہیں سب  
 مجبور لاچار تھے۔ اس کی صورت دیکھ کر شخص کو رحم آتا، آدمی ان کا کپڑا ہے۔ غذا  
 ہوئی بند چار پائی سے لگ گیا۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہر وقت بخار رہنے لگا۔  
 اب اگر آدمی تھی تو صرف اس جاندا کی جو شاہو کا نام تھی۔ اور یہ کہنا جائز ہو گا کہ  
 میاں سے تا امید ہو کر اور یہ سمجھ کر کہ موت تلنے والی اور صحت تلنے والی ہیں اس نے  
 اس کے علاج پر زیادہ توجہ نہ کی۔ دیر کا وقف شاہو کے دل پر دوسرا  
 صدمہ تھا۔ دنیا بدل گئی، اور زمانہ پلٹ گیا۔ شاہو جیسا لال گہری گویں  
 جاسویا۔ اور حسن جیسا جوان قبر کے کنارے جا پہنچا۔ مگر نہ فرق آیا تو شاہو  
 کے ڈھنگوں اور ویدوں میں۔ وہی کلب کے جلسے، وہی ترقی کی دھن، اور وہی  
 مذہب نفرت۔ حد یہ ہے کہ میاں کے مرض الموت میں بھی اس کی تفریح ناغہ نہ ہوئی۔  
 گھنٹوں حسن اکیلا پڑا رہتا، اور کوئی اتنا تک بیٹہ نہ ہوتا کہ حلق میں پانی پکڑا دے!  
 دوائی ٹھنڈائی تو تھی ہی نہیں۔ اور تھا بھی کون جو علاج کرنا۔ لے دیکر ایک بیوی ہی  
 بیوی اس کا بس چلتا تو شاید دو چار سانس پہلے ہی میاں کو پہنچا دیتی۔ علاج غذا  
 تسکین جو کچھ تھا وہ پانی۔ اس کے بھی لاسے پڑ گئے۔ جب بخار نے کسی طرح سمجھا نہ  
 چھوڑا تو حسن کی زندگی شاہو کو وبال جان ہو گئی۔ عجیبی گھر آجاتی ورنہ زیادہ  
 وقت کلب میں گزار دیتی۔ دوست آشنا، جان پیچھا لاتے اور دیکھ دیکھ کر ہمت  
 پکڑتے۔ حالت ردی ہوتے ہوئے یہاں تک پہنچی کہ ایک رات بالکل بیہوش پڑا رہا۔  
 شاہو نے سرشام کیفیت دیکھ لی تھی۔ مگر پڑ کر جو ڈھیر ہوئی تو آنکھ صبح ہی کو  
 کھلی۔ پاس آئی دیکھا، پوچھا، مگر جواب نہ ملا۔ تو اخبار دیکھنے چلی گئی۔ دنلے  
 کے بعد آئی تو معلوم ہوا کہ حسن کی روح کبھی کی دنیا سے رخصت ہو چکی تھی۔



## اٹھائیسواں باب

حسن کی موت پر عدت وغیرہ تو جاہلوں کا کام تھا۔ اس لئے شاہکی نے جائز رکھی ہی نہیں۔ غضب یہ کیا کہ نماز روزہ کے گہیدیں، یتیموں کو کھانا، اور مسکینوں کی خیرات بھی فضول سمجھ کر اڑادی۔ آمدنی میں کمی وقف کے بعد ہی شروع ہو گئی تھی۔ مگر دل بڑھا ہوا، جو پہلے چڑھے ہوئے۔ سینکڑوں روپے کے مقابلہ میں اب ساٹھ ستر روپے ماہوار حقیقت ہی کیا رکھتے تھے۔ جائداد بکنی شروع ہوئی۔ باپ نے ہر چند سمجھایا، ماں نے بہتیرے نشیب و فراز دکھائے۔ مگر انجن کا سالانہ جلسہ مدراس کا تھا۔ شرکت لازمی اور جانا ضرور۔ جوڑے اور کرایہ یہ اور وہ عرض دو ہزار روپے کو ایک مکان فروخت ہوا۔ قصہ کوتاہ ایک پانچ سال میں ساری جمع پونجی خالصے لگ گئی۔ اس وقت پھر ایک دفعہ باپ نے اور ماں نے کہنوتی نے، اور بہن نے کہا کہ ”روٹی تم کو اوتھنا کر کتوں کو، یہاں کیسی پڑی ہو، ہمارے ہاں آؤ۔ جو دال دلیا اللہ نے دیا ہے کھاؤ۔ اور خدا کا شکر کرو۔“ مگر خدا معلوم جھوٹی غیرت تھی، یا روکھی پھکی ٹکنت۔ منافرت کا اثر تھا یا تہذیب جدید کا خبط کہ ماں نے منتیں کیں۔ باپ نے خوشامد کی، بہنوتی نے سمجھایا، اور بہن نے ناک رگڑی، مگر اس نے منظور نہ کیا۔

بچہ کا دبا کا کچھ کم نہ تھا۔ اس پر افلاس کی مصیبت اور اتنی سنگین کہ جو ہاتھ بھر مٹھی روپے اور اثرفیاں لٹاتے تھے، وہ اب ایک ایک روپے کو ترسنے لگے۔ ماں میں کم نوحسن کی زندگی ہی میں ہو چکی تھیں۔ ایک البتہ اپنے دم کی تھی۔ اب اس کو بھی الگ کرنا پڑا۔ انقلابات ایسے نہ تھے کہ شاہکی کا پیچھا چھوڑ دینے۔ گھنٹوں بیٹھی اپنی حالت پر غور کرتی اور روتی جن کا ہر وقت سسر سسر کہتے، منہ خشک ہوتا تھا وہ اب اگر جھانکتی بھی نہ تھیں۔ دن شا کدھی لگائے کیلی ٹروں ٹوں پڑی رہتی۔ باپ کی مرضی اور ماں کی مانتا تھی۔ وہ دونوں وقت

کھانا بچہ جیتے۔ مگر ساتھ پاؤں تھک چکے اور محبت بگڑ چکی تھی۔ شکل سے ایک آدمی لڑا کھا سکتی۔  
اب البتہ شاہنشاہ کو معلوم ہوا کہ کیا کیا اور کیا کر چلی۔ دُور کے ڈھول سہاؤ سے  
جدت فقط ظاہری۔ ٹیپ ٹیپ کی دھن تھی۔ جس کا باطن زہر آلود اور سم قاتل مگر کیا  
کر سکتی تھی۔ دقت نکل چکا۔ سب سے بڑی چیز ندامت تھی۔ جو ہر وقت سر پر سوار  
تھی۔ افکار کا ہجوم۔ آلام کی بھرمار۔ بخار شروع ہوا۔ باپ نے تو کچھ نہ کیا۔ مگر ابا نے  
ایک دفعہ اور کوشش کی کہ ساتھ لجاؤں۔ لیکن ناکام رہی۔ انکار رہے سوار۔ بخار کم کیا۔  
اور ایک پندرہ ہی دن میں فیل کا فیل شاہنشاہ کو کھچڑی ہو گئی۔ مرے کو مارے  
شاہ مدار پیٹ میں ایک دروایسا اٹھتا تھا۔ کہ مچھلی کی طرح تڑپتی تھی۔ باپ نے میوں  
کو دکھایا سب نے رائے دی اندر پھوڑا ہے۔ علامہ ہر چند ہوئے۔ مگر فائدہ کی کوئی  
صورت نہ نکلی تو ایک روز ابا نے اس سے کہا۔

”بیٹی زندگی کا پہلا حصہ ختم کے قریب اور دوسرا شروع ہونے والا ہے۔

ختم ہونے والا فانی اور شروع ہونے والا ابدی ہے۔ یہ شے والا اور  
وہ رہنے والا۔ یہاں سکھ عارضی، اور دکھ چند روزہ ہے۔ وہاں کے  
ثواب مستقل اور عذاب اٹل ہیں۔ یہ سوانگ دیکھ لیا۔ اب وہ رنگ بچنا  
پڑے گا۔ یہ نئی جگہ اور غیر لوگ تھے، وہ انوکھی جگہ ہے، نہ اجنبی مقام۔  
دیکھا بھالا گھر جانے بوجھے لوگ، ملے کو پکی پکائی کھیتی تیار اور چٹا چٹایا  
گھر موجود۔ اب تک کے خیالات سخت دعوئے شدید اور رائیں مضبوط تھیں۔

مگر آج وقت ہے کہ طبیعت پر زور دے اور ایمان سے پوچھو کہ جو سفر دیش  
اور جو منزل سامنے ہے اس کے واسطے ضرورت کیا ہے۔ اور کیا کیا۔  
غور کرو کہ اس زندگی کی کوششیں، اور سوچو کہ یہاں کے تمام کام کس قدر  
خلو پر مبنی، اور صداقت پر محمول تھے۔ اس وقت کہ اس دنیا کے ہر

تعلق سے فراق ابدی ہو کر دہاں جاتی ہو جہاں ہمیشہ رہنا اور رہنا ٹھہرنا  
 اور رہنا ہے۔ کس طرح چلیں اور کیونکر رخصت ہوئیں۔ آگے کیا بھیجا اور  
 پیچھے کیا چھوڑا؟ ساتھ کیا لیا اور پاس کیا رکھا۔ کتنا نازک ہے یہ وقت  
 اور عبرت انگیز یہ سال کہ مجھ کرموں جلی ما اور بد نصیب باپ کے سوا اس عورت  
 کی میت پر جو چالیس برس دنیا میں رہی۔ کوئی دوا نسوگرانے وار نہ ہو اور ظہار  
 ملل محض اخباروں تک محدود رہے۔ زبان دنیا بھر کے جن کاموں میں  
 گرفتار رہی، دماغ زندگی کے جن جھگڑوں میں الجھا رہا، اس وقت ہی تصویریں  
 آنکھ کے سامنے ہیں۔ یہ وہ وقت تھا کہ زبان کلمہ توحید ادا کرتی اور دماغ مالک  
 حقیقی کے خوف سے تھرا اٹھتا۔ پٹی کے ارد گرد مسلمان عورتیں کلام پاک کی  
 صداؤں میں جو قدامت کا جو سر تھا تم کو دنیا سے وداع کرتیں اور بجائے  
 کہا روں کے کندھوں اور گاڑی کی چھتوں کے مسلمان شہنشاہ حقیقی کا زبان پڑھتے  
 ہوئے اپنے پاک کندھوں پر یادِ ضوئہا را جاذہ لیجائے۔ آج جدت ختم کو ان  
 سب چیزوں سے محروم کرتی ہے۔ مگر اس لئے کہ ابھی دماغ صحیح اور زبان کام  
 کے قابل ہے۔ بیٹی سمجھاتی ہوں کہ افلاس کی مصیبتیں، جدائی کے صدمے،  
 اور ناکامی کے بچ، اس باز پرس کے مقابلہ میں کچھ نہیں۔ توبہ کرو، معافی مانگو،  
 روؤ اور گڑ گڑاؤ۔ رحیم ہے کویم ہے۔ شاہد کلمہ پڑھ اور کہہ:-  
 ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ“

دنیا آج ختم ہوتی ہے، اور اس کے ساتھ ہی یہاں کی امنگیں اور حسرتیں بھی۔  
 اب معاملہ اس سے ہے جو حقیقی حاکم، اور سچا مالک، جہاں پہل پہل کا حساب اور  
 تہل تہل کا مواخذہ۔ ہاتھ اٹھا، ان ہاتھوں کو جوڑ، یہ وقت آخری سانس مہان، اُد  
 دنیا ختم ہے۔ گواہ کر مجھ کو اپنے اسلام کا اور اقرار کر باپ کے سامنے توحید کا، پناہ

بانگ اس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر اور بیج اس روز کے عذاب سے  
 جسکی شام نہیں۔ ما اور باپ جو عاشق زار تھے دونوں چھوٹے ہیں۔ اور دنیا اور زندگی  
 جسکی دیوانی رہی آکھ سے اوجھل ہوتے ہیں۔ ابھی وقت باقی اور موقعہ موجود ہے۔  
 ماں یہاں تک پہنچی تھی کہ شاہکار پر رقت طاری ہوگئی۔ اس نے مال کی طرف ہاتھ چڑھا کر  
 'ہاں موت میرے سر پر آپہنچی۔ اور جس چیز کو میں عمر بھر بھولتی رہی اب اس سے  
 چھٹکارا نہیں۔ اس وقت بھی کہ اذیت کے مارے جان نکل رہی ہے اور تکلیف  
 جان پر بنا رکھی ہے۔ جہاں اپنی بہت سی غلطیوں پر نادم ہوں وہاں نہایت ادا ہے  
 عرض کر دینی کہ مجھے اب بھی آپ کی بعض باتوں سے اتفاق نہیں ہے۔ دنیا اچھے  
 اور بُرے، فرمانبردار اور گنہگار بندوں سے بھری پڑی ہے۔ اس دنیا سے مجھ سے  
 بھی زیادہ گنہگار عورتوں کو دھکے دیکر نکالا ہے۔ بیشک میں رو سنا ہوں، اور  
 زندگی برائیوں سے تھڑی ہوئی ہو۔ لیکن خدا نے اپنے رحم و کرم سے بڑے بڑے  
 سرکشوں کا بیڑا پار کیا ہے۔ اسی کے فضل کی توقع مجھے بھی ہے۔ آپ کے خیالات  
 آپکی زندگی، آپ کی تلقین، امت مرحومہ کے لئے بہت کچھ مفید اور میں خدا کو شاہد  
 کرتے ہوئے کہتی ہوں کہ آپ کا وجود اگر مسلمانوں کے واسطے نہیں تو اسلام  
 کے واسطے بسا غنیمت ہے۔ لیکن وہی خدا جسکو میں گواہ کر رہی ہوں اچھی طرح  
 جانتا ہے کہ میں اس وقت بھی اس رائے پر صداقت سے قائم ہوں کہ قدامت  
 و در حاضرہ میں اصلاح کی محتاج ہے۔ اور اگر آپ جیسی محترم خواتین اس طرف توجہ  
 فرما کر قدامت اور حدت کو گلے ملادیں تو قوم اور مذہب دونوں پر ایک بڑا احسان  
 ہوگا۔ اما جان ابا وجود ان تمام عیوب کے جو حدت میں موجود ہیں یہ بلا ٹٹنے والی نہیں۔ اور  
 مسلمانوں کے واسطے سوا اسکے کوئی چارہ نہیں ہو کہ وہ وقت کا ساتھ دیں۔ اور اپنی آبائی جوہر  
 جنگو مجھ بد نصیب نے ہمیشہ ٹھکرایا محفوظ رکھیں۔ اور مذہب کو اپنا جزو عظم قرار دیں۔

میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ میرے بعد دنیا کی ہر خوشی اور زندگی کی ہر مسرت  
 آپ کے زخم پر کچھو سکے ہوگی۔ اور میری موت آپ کی زندگی کو مردہ کر دیگی لیکن میں  
 آپ سے التجا کرتی ہوں کہ جو کچھ میں چھوڑ رہی ہوں اس میں کو نصف مدرسہ کے  
 واسطے وقف ہو۔ آپ کو شش فرمائیے کہ ہمارے مدرسہ سے ایسی لڑکیاں نکلیں جو  
 سموری ہوئی قدامت کے نمونے ہوں اور اسلام کی برکتیں ان کے ہر قول و فعل سے ظاہر ہو  
 کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد شاہنشاہ نے پھر کہنا شروع کیا :-

”آپ نے مجھے یسین سنائی مگر میری روح اس وقت تک پرواز نہ  
 کرے گی۔ جب تک میں اپنے جرائم کی سزا کا پورا عقاب نہ کروں۔ اور  
 جب تک دنیا کے طاقتور اچھی طرح نہ دیکھ لیں کہ کمزوروں پرستم توڑنے  
 والے ظالم کو کس طرح موت آتی ہے۔ میں اب بھی یہ کہتی ہوں کہ مجھے  
 حقوق اللہ کا زیادہ اندیشہ نہیں ہے۔ ہاں خدا کی کمزور لاچار مخلوق  
 جو میرے ہاتھوں تاراج و تباہ ہوئی۔ یقیناً مجھ سے بدلے لے گی۔ اور  
 لے رہی ہے۔ اگر آپ کو مجھ سے سچی ہمدردی ہے تو منبراً اور رحیماً  
 کو بلائیے۔ میں ان سے اپنے مظالم کی معافی مانگوں اور بقیہ نصف وقف  
 ان کی خدمت میں پیش کروں کہ ان کی دعائیں میری اُوبت کا خاتمہ کریں۔۔۔۔۔  
 اما جان اعداء جلدی کیجئے۔ میرا دم نکلتا ہے۔ اور رکتا ہے ایک  
 تکلیف ہو تو کہوں۔ یہ جیم جیتے ہی جی آگ میں بھن رہا ہے عقل اسکو  
 بخار کہہ کر مٹھن ہو جائے۔ مذہب اس کو عذاب بتا بیگا۔ درد اور کسک  
 کی موجیں ہیں کہ بدن کے ہر حصہ سے اُمنڈ رہی ہیں۔ ہائے کیا کروں“  
 شاہنشاہ اسی طرح تڑپ رہی تھی کہ زاہد رحیماً اور منبراً کو لیکر اندر داخل  
 ہوئی۔ انکی صورت دیکھتے ہی ماں ہاتھ جوڑتی ہوئی اٹھی تو رحیماً نے رو کر کہا :-

”بیگم مجھے کیوں گنہگار کرتی ہو۔“ ماں نے پھر ہاتھ جوڑے اور کہا:۔  
 ”زندگی کی نخت اور خودداری کے جھوٹے ٹکھنڈے جو اچکل کی لڑکیوں کا  
 شیوہ ہو گیا ہے۔ بد نصیب شاہک کی آنکھوں پر پردے ڈال دے۔ اور اس نے  
 وہ حرکتیں کیں جو موت کے دروازے پر قصر زندگی کے بسنے والوں کے واسطے  
 سبق ہیں۔ میں تم سے اور بوا منیر سے بہت التجا کرتی ہوں کہ اس کا تصور  
 معاف کر دو۔ اپنی غلطیوں کی پاداش میں یہ اپنی آدمی جانا دو تمہاری خدمت  
 میں پیش کرتی ہے۔ یہ دستاویز قبول کرو۔ اور دعا کرو کہ خدا نے وحی و بشریٰ  
 اس پر رحم کرے۔ موت کی سختی اور قہر کا عذاب اس پر آسان ہو۔ اور قیامت  
 کے مواخذہ سے محفوظ رہے۔“

اس وقت شاہک نے دونوں کے آگے ہاتھ جوڑے۔ اس کی روتی ہوئی  
 آنکھیں نہامت سے جھکیں اور اتنا کہہ سکی:۔  
 ”خدا را میری خطا سے درگذر کیجئے“

رحیمہ کی بھی پچی بندھ گئی تھی۔ اُس نے شاہک کے سر پر ہاتھ پھیر کر  
 کہا:۔

”بیگم خدا تمہاری مانتا ٹھنڈی رکھے۔ اور شاہک بیوی کی عمر میں برکت دے۔  
 مجھے زاہد بیوی رستہ بھر ہی سمجھاتی لاتی ہیں۔ میں اس وقت پرانے جھکڑے نہیں  
 چھیڑتی۔ میں نے دل و جان سے معاف کیا۔ خدا معاف کرے۔“

اتنا سنتے ہی شاہک کے منہ کی زردی اطمینان کی ایک خفیف سی  
 سرخی میں تبدیل ہوئی۔ اُس نے آسان کی طرف ہاتھ اٹھائے۔ اور دل ہی  
 دل میں جو کچھ کہا وہ صرف ہنٹوں کی حرکت سے ظاہر ہوا مگر الفاظ سمجھ میں نہ آ سکے۔  
 اب شاہک کچھ دیر کے لئے آنکھیں بند کر بالکل خاموش ہو گئی۔ پھر زاہد کو

اشارے سے قریب بلایا، گلے سے لگایا، اور آہستہ سے کہا:-

”میرا یہ پیام مسلمان لڑکیوں تک پہنچا دینا۔“

”تعلیم جدید کے خطبے نے میری دنیا اور زندگی کو برباد کر دیا ضرورت تھی کہ دنیا میرے واسطے جنت اور زندگی دوسروں کی واسطے راحت ہوتی مگر میرے یہ دونوں جوہر غارت ہوئے۔“

اب میری دنیا ختم ہو رہی تھی اور اصلاح اور احتیاط تو دور کنار وہ وقت ہے کہ بچپنا

بھی نہیں سکتی۔ افسوس بات نہیں کجاتی۔۔۔۔۔ ہر وہ چیز جسے اپنا سچا ہم فقی مجھ سے

آنکھیں بدل گئی۔ یہاں تک کہ جلد خاکی کے اعضا بھی بے وفائی کر رہے ہیں۔ اور سب سے

مٹے ہوئے۔۔۔۔۔ تم مسلمان لڑکیوں کو یہ القاط پہنچا دینے کی ذمہ دار ہو کہ مسلمان

لڑکیاں اگر دنیا میں کامیاب ہو سکتی ہیں تو صرف مذہب کے سایہ میں جس گھر نے جس

لڑکی نے مذہب کو ٹھکرایا وہ باور رکھے کہ دنیا اس کو کتنے سی موت مارے گی۔۔۔۔۔

ہائے زار کیا کروں باتنا نہیں کی جاتی۔۔۔۔۔

اس کے بعد رک رک کر شاہکار کچھ اور باتیں جو اچھی طرح سمجھ میں نہ آ سکتی تھیں

تھیں کہ وہی تھی کہ روز روشن کی واداع کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو گئی۔

## ختم شد

**اطلاع و انتباہ** جوہر قدامت ۱۹۱۹ء کی تصنیف ہے اور ہزاروں  
نقاد میں کئی مرتبہ شائع ہو چکی ہے جنوری ۱۹۳۶ء  
میں حضرت مصطفیٰ مرحوم نے اس پر نظر ثانی فرمائی تھی۔ جوہر قدامت کا دائمی حق اشاعت محفوظ  
کوئی عاصب اسے یا اسکے کسی حصہ کو چھاپنے اور شائع کرنا قصداً نہ فرمائیں۔ ورنہ اخلاقی ہی نہیں  
قانونی جرم کے بھی مرتکب بن گئے۔ اور انہیں بہت برا خیال رہے جگستا پڑے گا۔

رازق الخیری دفتر عصمت دہلی

# مصوّر غم

مصوّر غم حضرت علامہ سید الشہداء الخیر (رحمۃ اللہ علیہ) کے روٹ کر روٹ جنت نصیب کرے )  
 شاہجہان آباد کے اُس مفتقدار ممتاز خاندان کے فرزند رشید تھے جسے خاندان شاہان مغلیہ  
 کے مٹا دھونے کا سلسلہ بدستور حاصل رہا۔ جس نے مولوی عبدالحق صاحب مرحوم مولوی  
 عبدالمقادر صاحب مرحوم اور ہندوستان کے مشہور سحرالبیان مولوی عیدالرب خفوریانی  
 جامع مسجد سہارنپور جیسے جیسے علما و اوز قرآن و حدیث کے نامور ماہرین پیدا کئے۔ یہ آج کے دیار کا  
 وہ نامور خاندان تھا جس کی بیٹیاں حافظہ حاجیہ - تاریہ ام عطیہ النساء مرحومہ (چھوٹی اُستانی جی)  
 اور حاجیہ ام ذکیہ مرحومہ جیسے مشہور عالمہ فاضلہ خواتین اور جس کے داماد تیسرے علما مولوی  
 نذیر احمد مرحوم جیسے نامور بزرگ تھے حضرت علامہ مخفور بمقام دہلی جنوری ۱۳۳۵ء میں پیدا  
 ہوئے اور ابھی نو برس ہی کے تھے کہ ان کے والد ماجد مولوی حافظ عبدالحق صاحب  
 نے حیدرآباد دکن میں جہاں وہ محکمہ بندوبست میں افسر علی تھے انتقال فرمایا۔ اور حضرت علامہ مرحوم  
 کی تعلیم دہلی میں ان کے دادا اور چچا حضرت مولوی عبدالمقادر صاحب مرحوم اور خانبہار مولوی  
 عبدالحق صاحب مرحوم ڈپٹی کلکٹر کی نگہداری میں ہونے لگی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب انگریزی تعلیم کو مسلمان کفر سمجھ رہے تھے۔ اس لئے حضرت علامہ مخفور  
 نے اردو فارسی عربی وغیرہ گھر پر پڑھی۔ پھر انگریزی تعلیم دہلی کے عربک اسکول میں ہوئی۔ مگر انھوں  
 نے اپنے شوق سے اسے بہت کچھ ترقی دی۔ مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم (جو علامہ مرحوم کے  
 حقیقی بھوپا تھے) اور مولانا محالی مرحوم کی شاگردی نے علامہ مخفور کی قابلیت کی ترقی میں چار چاند  
 لگا دیے اور ابھی حضرت علامہ انٹرنس ہی میں تھے کہ ان کی ذہانت کا چرچا ہونے لگا۔

”تکمیل تعلیم کے بعد مولوی عبدالحق صاحب بانی جامع مسجد بھجور کی اکلوتی صاحبزادی  
 سے جنوری ۱۳۳۷ء میں شادی ہوئی اور اگلے ہی سال میں محکمہ بندوبست کے انگریزی دفتر میں ملازمت  
 شروع کی۔ مگر ملازمت کی پابندی حضرت علامہ کی طبیعت کے خلاف تھی اور دفتر کے خشک  
 کاموں میں جی نہ لگتا تھا۔ پھر علامہ مرحوم کی والدہ مرحومہ اپنے اکلوتے بیٹے کی جدائی زیادہ روز  
 کے لئے گوارا نہ کر سکتی تھیں ان وجہ سے جم کر ایک جگہ نوکری نہ کی۔ اور ترقی کے نہایت معقول مواقع  
 میسر نہ ہونے پر ان کی طرف مطلق توجہ نہ فرمائی۔ اور م۔ ناڈ۔ مین پوری۔ میرٹھ۔ علی گڑھ۔ دہلی۔ دکن



۲ کی تبدیلی ہوتی رہی آخر دہائی کے پوسٹل آرڈر آفس میں تبدیل ہو گئے۔ مگر چند سال گزرے تھے کہ ۱۹۱۶ء میں اٹھارہ انیس سال کی لازمیت سے استعفا دے دیا۔

حضرت علامہ راستدار الخیری رحمۃ اللہ علیہ کی سب سے پہلی تصنیف ”حیات صالحہ“ یا ”صالحات“ ہے جو ۱۸۹۵ء میں بھی گئی۔ ۱۸۹۸ء میں دوسری تصنیف ”منار اللمعات“ ختم کی۔ ان دونوں مصلحی ناولوں کی اشاعت کے بعد حضرت علامہ مغفور کا شہرہ ایک مقبول پایہ تصنیف کی حیثیت سے بلند ہونا شروع ہوا۔ ۱۹۰۷ء سے رسالہ ”محرور“ میں افسانے اور مضامین شائع ہونے لگے۔ پھر ”صحیح زندگی“ شائع ہوئی۔ اور دہائی کے ہاکمال ادیب کی طرز تحریر کی دلاویزی زبان کی شیرینی اور دانتوں کے پیرایہ بیان کی ورداگیری کی دھوم مچنے لگی۔ ۱۹۰۸ء میں رسالہ عصمت جاری کیا۔ جو ۳۰ سال سے برابر شائع ہو رہا ہے اور ہندوستان کا بہترین زمانہ پرچسپیم کیا جا رہا ہے۔ ۱۹۱۱ء میں حقوق نسواں کی حمایت میں رسالہ ”تمتدن“ جاری کیا۔ جو پانچ سال تک بڑی خوبی کے ساتھ اپنے قرائن انجام دیتا رہا۔ ۱۹۱۲ء میں اخبار ”سبیل“ جاری فرمایا۔ مگر ۱۹۱۳ء میں دفتر عصمت میں قیامت کی آگ لگ گئی۔ اور سبیل جاری نہ رہ سکا۔ ۱۹۱۵ء میں ”شام زندگی“ شائع ہوئی اور اسے وہ مقبولیت حاصل ہوئی کہ پہلے ہی سال میں تین مرتبہ چھپی۔ اس کتاب نے قوم سے حضرت علامہ مغفور کو مصور غم کا خطاب دلوا دیا۔ اب اردو کے بے مثل مصنف نے تصانیف کا ڈھیر لگا دیا۔ اور دوسروں کے قریب فحیم کتابیں ۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۲ء تک کے زمانہ میں لکھ ڈالیں۔ جو مختلف حضرات نے لکھائیں اور بقول ایک ادیب ”لاکھوں روپیہ پیدا کیا“ حضرت مصور غم نے اپنی تصانیف کی جو مقبولیت دیکھی شاید اردو کے کسی مصنف کو دیکھی نصیب نہ ہوئی۔ ایک دو نہیں درجنوں کتابیں آٹھ آٹھ دس دس سال کے عرصہ میں دس دس بارہ دفعہ چھپیں۔ بلکہ ”صحیح زندگی“ ”شام زندگی“ ”دیگرہ کے نو پندرہ پندرہ میں ہیں ایڈیشن شائع ہوئے۔ آخری دو کتابیں ”آمنہ کالال“ ”سیدہ کالال“ بھی چار ساڑھے چار سال میں ہزار ہا کی تعداد میں پانچ دفعہ چھپ کر ہاتھوں ہاتھ مکمل گئیں۔

۱۹۱۹ء میں پنجاب یونیورسٹی نے اردو کو رس علامہ مغفور سے صحیح کرائے۔ ۱۹۲۰ء میں شیل یونیورسٹی نے سب سے پہلا اردو امتحان مقرر کیا۔ ۱۹۲۲ء میں حکومت ہندوستان نے شمالی ہند سے بحیثیت ارا اردو کے اردو ہندی کی ترقی کے سلسلہ میں حضرت مرحوم سے پیش بہا مشورے لئے۔

۱۹۲۲ء میں سلطان بچوں کے لئے تربیت گاہ بنات قائم کی جس سے ہندوستان کے مختلف حصوں کی سینکڑوں خوشحال اور یتیم نادار بچوں نے بحیثیت بورڈز تعلیم و تربیت حاصل کی۔ اور جس سے ہزاروں غریب کم استطاعت بچیاں زبور تعلیم سے آراستہ ہوئیں۔ اس مدرسہ کے لئے بیگم صاحبہ عمرتہ کے







۵۳۱۰۵۳۱۰۱  
۹۶۸۳۹

CALL No. { ۸۹۱۵۲۴۳۳ } ACC. No. ۹۶۸۳۹  
 { ۹۶۸۳۹ }  
 AUTHOR ۱۱ شرا الخیری  
 TITLE جہانگیر نامہ

T 10 80 8  
 ۹۶۸۳۹  
 ۹۶۸۳۹  
 ۱۱ شرا الخیری  
 جہانگیر نامہ

AT THE TIME  
 7.08

Date	No.	Date	No.
T 27.12.01	1629	T 11.02.08	SA-7512
			708



## MAULANA AZAD LIBRARY ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY

### RULES:—

1. The book must be returned on the date stamped above.
2. A fine of Re. 1-00 per volume per day shall be charged for text-books and 10 Paise per volume per day for general books kept over - due.

